اسلام کا معاشی نظام

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ خدّام القرآن لاہور
36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 5869501-03

تقدیم

یہ کتابچہ راقم الحروف کی آج سے تین چار سال قبل کی دو تقریروں پر مشتمل ہے: پہلی زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں کی گئی تھی اور دوسری محکمہ محنت پنجاب کے زیر اہتمام مل مالکان اور مزدور لیڈروں کے ایک مشترک اجتماع میں کی گئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں ہی تقریریں میں نے حسب عادت "رواروی" میں کی تھیں اور میرا ہرگز خیال نہیں تھا کہ ان میں ایسی کوئی خاص یا اہم یا نئی بات ہے۔ لیکن ان دونوں کی پذیرائی میرے اندازے سے بہت بڑھ کر ہوئی۔ خصوصاً فیصل آباد کی تقریر کے صدر تھے ڈاکٹر غلام رسول چودھری جو خود معاشیات میں پی، ایچ ڈی ہیں۔ ان کا تاثر تو اُن کے رقم کردہ پیش لفظ میں قارئین کے سامنے آ ہی جائے گا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اُس اجتماع میں چودھری صاحب کے علاوہ مزید نصف درجن سے زائد معاشیات کے پی ایچ ڈی موجود تھے ـــــ بعد میں چائے کے اجتماع پر اُن سب حضرات نے متفقہ طور پر فرمایا کہ آج پہلی بار اسلام کا معاشی نظام کچھ سمجھ میں آیا ہے۔ میں نے اسے کچھ تو اُن حضرات کے حُسنِ ظن پر محمول کیا اور کچھ اس پر کہ میری ہمّت افزائی مقصود ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ میں نے اپنی ان تقریروں کو ہرگز قابل اشاعت نہیں سمجھا تھا۔ البتہ یہ ضرور خیال تھا کہ کبھی فرصت ملی تو نظرثانی کے بعد اشاعت ہو سکتی ہے۔ لیکن محترم چوہدری غلام رسُول صاحب نے ان کی اس درجہ قدر افزائی فرمائی کہ دونوں تقریروں کو خود ٹیپ سے منتقل کرا کے، اپنے ذاتی خرچ پر ایک کتابچے کی صُورت میں غالباً دس ہزار کی تعداد میں طبع کرایا، اور مُفت تقسیم کیا۔ اللہ تعالےٰ انہیں اس کا اجر عطا فرمائے۔ آمین۔

ادھر کچھ عرصہ سے بعض احباب کا شدید تقاضا تھا کہ ہم اسے خود اپنے اہتمام میں بھی شائع کریں۔ اس ضمن میں بھی چوہدری صاحب نے مزید کرم یہ فرمایا کہ کتابت شدہ کاپیاں عنایت فرما دیں۔ چنانچہ یہ کتابچہ بالکل مِن وعَن اُسی صُورت میں شائع ہو رہا ہے جس میں چوہدری صاحب نے طبع کرایا تھا۔ اس ضمن میں قارئین سے یہ معذرت کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دونوں تقریروں میں بعض مضامین مکرّر آئے ہیں۔ اب یہ آپ کے ذوق پر منحصر ہے، چاہیں تو اسے 'قندِ مکرّر' سے تعبیر فرمالیں، اور چاہیں تو بد مذاقی پر محمول کر لیں۔

مَیں چونکہ نہ معاشیات کا باضابطہ طالبعلم ہوں نہ فقہ اسلامی کا ماہر — لہٰذا اس میں غلطیاں لازمًا ہوں گی۔ جو حضرات اس ضمن میں مجھے متنبہ فرمانے کی تکلیف گوارا فرمائیں ان کا پیشگی شکریہ!

ان دو تقاریر کے علاوہ اس کتابچے میں موضوع کی مناسبت سے دو مختصر چیزیں مزید شامل کی جا رہی ہیں: ایک راقم کا ایک مختصر مقالہ جو اُس نے "اسلام کا نظامِ محاصل" کے عنوان سے لائنز کلب لاہور کے سالانہ اجلاس میں پڑھا تھا۔ اس میں اسلام کے معاشی نظام کے بارے میں بعض اُصولی باتیں تو پھر مکرّر آگئی ہیں تاہم اہلِ فکر کے لئے چند نئے نکات قابلِ غور موجود ہیں — اور دوسرے پاکستان کے 'نظامِ محاصل' کے اس اہم ترین مسئلے پر کہ آیا یہاں کی اراضی عُشری ہیں یا خراجی، پروفیسر رفیع اللہ شہاب صاحب کا ایک مختصر مراسلہ جو 'میثاق' جنوری فروری ۸۱ء میں شائع ہوا تھا، جس میں اس موضوع پر نہایت اہم حوالے موجود ہیں۔

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

لاہور ۲۲ر اگست ۸۵ء

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب دینی حلقوں میں تو کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ڈاکٹر صاحب اس اعتبار سے ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں کہ آپ کی بنیادی تعلیم سائنس اور طب کی ہے مگر آپ کی نمایاں خدمات دینِ اسلام کی تعلیم و تبلیغ میں نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایسے وقت میں طب کے پیشہ کو ترک کر کے اپنی تمام تر صلاحیتوں اور اوقات کو دین کے احیاء کے لیے وقف کیا جب اُمت قحط الرّجال کا شکار تھی .... لہٰذا ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبال کے شعر ؎

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

کے مصداق اُمت کی پاسبانی فرمائی۔

راقم الحروف جب ایچی سن کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے تعینات تھا اس وقت ڈاکٹر صاحب کو وقتاً فوقتاً زحمت دیتا رہا مگر ہر دفعہ ڈاکٹر صاحب نے ہماری دعوت کو شرفِ قبولیت بخشا اور نہ صرف کالج کے طلبہ اور اساتذہ کو اپنے ایمان افروز خطابات سے نوازا بلکہ کالج کی جزوقتی لیکچرر شپ بھی قبول فرما لی۔ اس دوران ڈاکٹر صاحب کے دو اہم خطابات "نجات کی راہ" اور "علامہ اقبال اور ہم" راقم نے بڑے شوق سے طبع کروائے اور بہت پسند کیے گئے۔

بعد ازاں جب مجھے زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا تو ڈاکٹر صاحب تکلیف فرما کر وقتاً فوقتاً یونیورسٹی تشریف لے جاتے رہے اور خطاباتِ جُمعہ کے علاوہ "سیرۃ النبیؐ" اور "اُمتِ مسلمہ کا ماضی، حال اور مستقبل" جیسے اہم موضوعات پر یادگار خطاب فرمائے اور ڈاکٹر صاحب نے زرعی یونیورسٹی کے سینیٹ اور سنڈیکیٹ کی رکنیت بھی قبول فرما لی۔

راقم کا گہرا احساس یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اللہ نے جو قوتِ استدلال

انداز بیان اور قوتِ افہام عطا فرمائی ہے وہ اس نے آج تک کسی پروفیسر میں نہیں پائی۔

معاشیات کے میدان میں اسلام کی اصل تعلیمات کیا ہیں ؟ یہ وہ مسئلہ ہے کہ جس پر کوئی واضح بات تاحال سامنے نہیں آئی تھی۔ ہماری کوشش زیادہ تر یہی رہی کہ Western Economics میں چند تبدیلیاں کر کے اسی کو اسلام کے مطابق ڈھالا جائے، جو مناسب نہیں ـــــ چونکہ راقم بھی اسی شعبۂ علم سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس کو اِس مضمون سے خاص دلچسپی تھی۔ لہذا ہم نے اس معاملے میں بھی ڈاکٹر صاحب سے رجوع کیا۔ اور ڈاکٹر صاحب نے زرعی یونیورسٹی کے کلیہ معاشیات و دیہی عمرانیات کے تحت طلبہ و ماہرینِ معاشیات سے "اسلام کا معاشی نظام" کے موضوع پر مفصل خطاب فرمایا... ڈاکٹر صاحب کے اس خطاب سے جہاں اسلام کی تعلیمات کے نئے گوشے سامنے آئے وہاں یہ امر سب حاضرین کے لیے حیرت کا باعث ہُوا کہ ڈاکٹر صاحب معاشیات کے نہ تو کبھی طالب علم رہے تھے اور نہ ہی اس شعبہ سے کبھی متعلق ۔ لیکن اپنی بصیرتِ باطنی کی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب ایک بہت بڑے معیشت دان معلوم ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس خطاب میں اسلام کی اصلی تعلیمات کو قرآنِ حکیم کی محکم آیات کے حوالے سے پیش کیا اور عام معمول کے خلاف ڈاکٹر صاحب نے موجودہ نظاموں میں سے کسی پر اسلام کی مُہرِ تصدیق ثبت کرنے کی بجائے اسلام کی اپنی تعلیمات کو پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ اشتراکی نظام کا آئیڈیل "مساوات" اور سرمایہ دارانہ نظام کا آئیڈیل "آزادی" ہے جبکہ اسلام مساوات اور آزادی دونوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے جب کہ اس کا اصل نعرہ "عدل" ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسلام کے "روحانی" اور "قانونی" نظام کا جو فرق بیان فرمایا اس نے تو گویا اس موضوع پر جملہ پیچیدگیوں کو حل کر دیا ۔

مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ تحقیق و تجسس کی نئی راہیں کھولے گا اور ملکی معیشت کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے ممد و معاون ثابت ہو گا۔

غُلام رسُول چودھری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ؕ

اسلام کا معاشی نظام

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ ۔ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَنَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ فَصَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا اَمَّا بَعْدُ :

حضرات ! اس دور کے بارے میں ایک بات عام طور پر کہی جاتی ہے جو کچھ زیادہ غلط بھی نہیں ہے کہ یہ معاشیات کا دَور ہے۔واقعہ یہ ہے کہ آج کا انسان بنیادی طور پر معاشی انسان بن کر رہ گیا ہے۔

اجتماعیاتِ انسانی میں بھی یقیناً معاشیات اور اقتصادیات کو بنیادی اہمیّت حاصل ہے۔ اور ہمارے ملک میں اسلام کی جانب جو قدم اٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے اس کے ضمن میں فطری طور پر یہ سوال ذہنوں کو پریشان کر رہا ہے کہ اسلام کا اقتصادی نظام کیا ہے ؟ بعض لوگوں نے اسلامی اقتصادیات کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی وجہ سے ایک تصوّر لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہے کہ شاید اسلام کا اقتصادی نظام ہمارے موجودہ نظام میں زکوٰۃ اور عشر کے اضافے اور ذرا مزید ہمّت کرکے سُود کی لعنت کو ختم کر دینے کا نام ہے. گویا معیشت کا بنیادی ڈھانچہ یہی رہے گا اور بس اتنا سا تغیّر و تبدّل ہی مطلوب ہے اور اسی بنیاد پر کچھ لوگ بدنیتی کے تحت اور کچھ مغالطے سے لوگوں کو بدظن کر رہے ہیں کہ اسلام کے پاس معاشی مسائل کا کوئی حقیقی، واقعی اور

مؤثر حل موجود نہیں ہے ۔ میں اسی لیے آج یہ جرأت کر رہا ہوں کہ اسلام کے معاشی نظام یا قرآن مجید کی اقتصادی ہدایات کے بارے میں کچھ معروضات پیش کروں۔
حضرات ! میں اپنی اصل گفتگو کا آغاز کرنے سے قبل دو معذرتیں پیش کروں گا اور دو مقدمات ۔

معذرتیں

الف : پہلی معذرت تو یہ کہ اصولاً اسلامی معاشیات پر گفتگو کرنے والے شخص کو جدید معاشیات اور اقتصادیات کا علم بھی براہِ راست ہونا چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن و حدیث اور فقہ پر بھی اس کی نظر بہت گہری ہو۔ ورنہ کم ازکم کسی ایک میدان کے اعتبار سے تو وہ یہ دعوے کر سکے کہ اس کے علم کی تحصیل کسی درجے میں اس نے مکمل کر لی ہے ۔ جبکہ مجھے ان میں سے کسی چیز کا دعویٰ نہیں ... میں اپنے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں قرآن مجید کا طالب علم ہوں ۔ البتہ قرآن چونکہ هُدًى لِّلنَّاسِ (تمام انسانوں کے لیے راہنمائی) ہے اور اس کا اصل موضوع ہی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق رہنمائی دینا ہے ۔ لہذا اصولاً بھی یہ ممکن نہیں تھا اور فی الواقع بھی ایسا نہیں ہے کہ معاشیات جیسے اہم موضوع پر کوئی ہدایات اس میں نہ دی گئی ہوں۔ چنانچہ اس میں جہاں عبادات کے متعلق احکام بیان ہوئے ہیں اور ان کی حکمتیں بھی زیرِ بحث آئی ہیں ، اسی طرح زندگی کے تمام گوشے اس میں موضوعِ بحث بنے ہیں اور اس ضمن میں احکامات بھی وارد ہوئے ہیں اور ان کی حکمتوں کا بیان بھی ہوا ہے چنانچہ معاشیات کے اعتبار سے بھی قرآن مجید میں ایک طرف تو کھلے کھلے احکام بیان کیے گئے ہیں دوسری طرف کچھ ایسے مقاصد اور بنیادی حکمتوں کی نشان دہی کی گئی ہے جن کا لحاظ ان احکام میں رکھا گیا ہے ۔لہذا میں ان دونوں پہلوؤں سے کوشش کروں گا کہ اپنے مطالعے کا حاصل آپ حضرات کے سامنے لاؤں۔

ب : دوسری معذرت یہ ہے کہ میں آپ حضرات کے سامنے اپنی بات نہ فلسفیانہ انداز میں پیش کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں اور نہ میں اس کی کوشش ہی

کروں گا۔ میری کوشش یہ ہو گی کہ جن اصطلاحات کے لوگ عادی ہو چکے ہیں انہی کے حوالے سے بات کروں تاکہ بات فوراً سمجھ میں آ جائے۔ مثلاً Capitalism (سرمایہ داری نظام) اور Socialism (اشتراکی نظامِ معیشت) کی اصطلاحات ہمارے ہاں معروف ہیں۔ لوگ اکثر و بیشتر ان اصطلاحات اور ان کے مفہوم سے بنیادی طور پر واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ ہی وہ نظام ہائے معیشت ہیں جو اس وقت بالفعل دنیا میں قائم ہیں[1] مجھے خوب اندیشہ ہے کہ اس طرح عین ممکن ہے کہ مجھ پر Over simplification کا الزام عاید کیا جائے یا کوئی صاحب یہ سمجھیں کہ میں جدید اصطلاحات سے مرعوب ہوں، لیکن اس کے باوجود میں بات پہنچانے کے لیے اس طریق کو اختیار کر رہا ہوں کیونکہ میرے نزدیک بات ذہنوں تک پہنچانے کے لیے یہی طریقہ سب سے مؤثر ہے۔

دو مقدمات

اب میں چاہتا ہوں کہ دو مقدمات آپ کے سامنے رکھوں کیونکہ میری گفتگو انہی پر مبنی (Based) ہو گی۔

پہلا مقدمہ : اس اصول پر مبنی ہے کہ دنیا کے ہر نظام کے دو پہلو ہوتے ہیں : ایک فکری اساس اور دوسرا علمی ڈھانچہ۔ یہ دونوں پہلو باہم مربوط ہوتے ہیں اور کسی بھی نظام کو اس کی فکری اساس سے ہٹا کر موضوعِ گفتگو نہیں بنایا جا سکتا۔ اسی طرح اسلام کے بارے میں نظریاتی اساس اور بنیاد کا معاملہ انتہائی اہم ہے جس کو ہم اصطلاحاً ایمان سے تعبیر کرتے ہیں .... اسلام درحقیقت ایمان پر قائم ہے۔ اللہ پر یقین کہ اس کائنات کا ایک خالق اور مالک ہے۔ اس نے اس کائنات کو اِلَىٰٓ اَجَلٍ مُّسَمًّى (ایک متعین وقت تک) کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ ہمیشہ باقی رہنے والی چیز نہیں ہے اور ہماری زندگی یہ دُنیوی زندگی

[1] ہم اس بات کے مدعی ہیں کہ ہمارے پاس ایک تیسرا نظامِ معیشت ہے، جو ان دونوں کے اچھے پہلوؤں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے لیکن یہ چیز اس وقت تک صرف ایک دعویٰ کی حیثیت رکھتی ہے جب تک کسی معاشرے یا کسی ملک میں یہ نظام قائم کر کے نہ دکھایا جائے۔

ہی نہیں بلکہ اصل زندگی موت کے بعد ہے۔ انسان کا اصل مسئلہ اُس زندگی سے متعلق ہے، اِس زندگی سے نہیں۔ گویا ہماری اعتقادی اساس اور نظریاتی بنیاد کے اعتبار سے نسبت و تناسب (Ratio and proportion) میں اس دنیوی زندگی کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں، یہ تو گویا نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ عارضی اور فانی ہے جب کہ وہ ابدی ہے اور ہمیشہ کی زندگی ہے۔ یہ ہمارے ایمان کی دو بنیادیں ہیں جو قرآن حکیم کی ایک ہی آیت میں ان مختصر الفاظ میں سموئی ہوئی ہیں: "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ" کہ اللہ ہی ہمارا مبدأ بھی ہے اور معاد بھی۔ یعنی ہم اللہ کے پاس سے آئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ ایمان اگر واقعتاً دل میں موجود ہو تو اس کا حاصل تو یہی ہے کہ دنیا میں اس طرح زندگی بسر کی جائے جیسے کوئی اجنبی ہو یا راہ چلنے والا مسافر[1]۔ ایک راہ گزر کو اپنے راستے سے جو دلچسپی ہو سکتی ہے اس دنیا اور اس کے متعلقات کے ساتھ اس سے زائد دلچسپی از رُوئے ایمان درست نہیں ہے۔ اسلام کی اس بنیاد سے دو نتیجے اخذ کیجیے۔

(۱) پہلا یہ کہ اگرچہ سوشلزم اور سرمایہ دارانہ نظام بظاہر تو ایک دوسرے کی کامل ضد ہیں کیونکہ نظام کے اعتبار سے ایک مشرق کی بات ہے تو دوسری مغرب کی، لیکن فکری بنیاد ان دونوں کی ایک ہی ہے یعنی مادہ پرستی۔ یہ مادّیت (Materialism) ہی تھی جس نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر جدلی مادّیت (Dialectical Materialism) کی شکل اختیار کر لی ہے۔ مادّیت ہی بنیاد ہے مغربی جمہوریت (Western democracy) کی کہ جس کے ساتھ کیپیٹلزم کا ضمیمہ لگا ہوا ہے اور اس مادّیت ہی کی ایک زیادہ ترقی یافتہ شکل جدلی مادیت ہے جس سے وہ دوسرا نظام پھوٹا ہے جسے ہم سوشلزم اور کیمونزم یا اس کے مختلف شیڈز (Shades) سے پہچانتے ہیں ــــ ایک بات تو یہ پیش نظر رہے کہ اسلام کا معاملہ ان

---

[1] حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے شانے پکڑ کر از راہِ شفقت فرمایا "کن فی الدنیا کانك غریب او عابر سبیل" دنیا میں اس طرح رہو جیسے کوئی اجنبی یا راہ چلتا مُسافر۔

دونوں سے بنیادی طور پر جُدا ہے[1]

(۲) اور دوسری بات ذہن میں یہ رکھنا ہو گی کہ چونکہ اسلام کا نظام اپنے تفصیلی ڈھانچے سمیت صرف اپنی بنیاد پر ہی قائم ہو سکتا ہے اور یہ کسی دوسرے نظام کی پیوندکاری قبول نہیں کرتا لہٰذا پہلے اس نظریاتی بنیاد کا استحکام ضروری ہے اس لیے کہ اسلام کھڑا ہوگا تو ایمان کی بنیاد پر۔

دُوسرا مُقدّمہ

گو ایمان کی رُو سے اصل اہمیّت معاد (آخرت) کی ہے، معاش کی نہیں۔ یہ دُنیا اور اس کا سازوسامان یہیں رہ جانے والا ہے اور انسانوں کے لیے ثانوی اہمیّت کا حامل ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اسلام کے پورے نظامِ فکروعمل میں عدل وقسط اور انصاف کے قیام کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی جو شانیں بیان ہوئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ قَآئِماً بِالْقِسْطِ[2] ہے (یعنی عدل و انصاف کو قائم کرنے والا)

پھر اسی کا حکم سورۃ النساء میں ان الفاظ مُبارکہ میں وارد ہوا:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ (النساء ۱۳۵)

اے ایمان والو۔ عدل و انصاف کے قائم کرنے والے اور اللہ کے گواہ بنو۔

اور سورۃ المائدہ میں یہی حکم عکسی ترتیب سے وارد ہُوا ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰامِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ (المائدہ ۸)

اے ایمان والو۔ اللہ کے لیے پُوری قوت کے ساتھ کھڑے ہونے والے اور عدل و انصاف کے گواہ بن جاؤ۔

ان سے اہم تر ہے یہ حقیقت کہ قرآن حکیم میں ایسی آیات بھی ہیں جن میں بالکل معیّن طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ کتابوں کے نازل کرنے اور رسولوں کے بھیجنے کا اصل مقصد اور اسلام کے پورے نظام کا مرکزی خیال ہی عدل و قسط کا نظام قائم کرنا ہے۔

---

[1] الکفر ملّۃ واحدہ۔ کفر کے کتنے بھی رنگ (Shades) ہوں کتنی ہی مختلف صورتیں ہوں وہ درحقیقت ایک ہی شے ہے ایک ہی ملّت ہے۔

[2] سورۃ آل عمران آیت ۸ ۔

گویا اسلام کے نزدیک یہ ایک اہم قدر ہے ۔ فرمایا :
لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۔ (الحدید ۔ آیت ۲۵) انبیاء و رسل کے بارے میں اس عام قاعدہ کلیہ پر مستزاد ہے وہ ہدایت جو معیّن طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی.

" تم (اسے محمدؐ) اسی دین کی طرف لوگوں کو بلاتے رہنا اور جیسا تمھیں حکم ہُوا ہے اسی پر قائم رہنا اوران کی خواہشات کی پیروی نہ کرنا اور کہہ دو کہ جو کتاب اللہ نے نازل فرمائی ہے میں اس پر ایمان رکھتا ہوں اور مجھے حکم ہوا ہے کہ تمھارے درمیان انصاف کروں" (سورۃ الشوریٰ آیت ۱۵)

جب مسلمان ایران پر حملہ آور ہوئے تو ایرانیوں نے حملے کی وجہ دریافت کی، تو فاتح ایران حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ نے ان الفاظ میں ان کو جواب دیا :

" ہم تو بھیجے گئے ہیں (خود نہیں آئے) کہ لوگوں کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان کے نور میں اور بادشاہوں کے ظلم وستم کے پنجے سے نکال کر اسلام کے عدل میں لے آئیں".

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وہ خطبہ جو آپ نے بیعتِ خلافت کے بعد ارشاد فرمایا تھا اور جو واقعتاً ایک اسلامی ریاست کے مقاصد کو متعین کرتا ہے اس میں وہ جملہ یاد رکھنے کے قابل ہے :

" تم میں سے ہر قوی میرے لیے ضعیف ہے جب تک اس سے حق وصول نہ کرلوں اور تم میں سے ہر ضعیف میرے لیے قوی رہے گا جب تک اس کو اس کا حق نہ دلوا دوں"۔۔۔ تو گویا قیامِ عدل و قسط اسلام کا مرکزی خیال ہے ۔

حال ہی میں جو سالانہ قرآن کانفرنس کراچی میں ہوئی اس میں ایک صاحب نے بڑی عمدہ بات کی طرف توجہ دلائی کہ اس وقت جو دو نظام دنیا میں قائم ہیں ان میں ایک ایک لفظ مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ کیپیٹلزم کا مرکزی خیال آزادی (Freedom) ہے جبکہ کمیونزم کا مساوات (Equality) ہے یہ ان لوگوں کے سلوگن ہیں ۔ ذہن میں رہے کہ یہ دونوں بڑی اہم انسانی قدریں ہیں ۔ لیکن اسلام کا بنیادی

خیال (Basic theme) "عدل" ہے۔ وہ آزادی اور مساوات دونوں کو عدل کا پابند کرتا ہے۔ گویا وہ آزادی اور مساوات کے درمیان بھی عدل قائم کرتا ہے تاکہ نہ آزادی اتنی بڑھ جائے کہ مساوات کو بالکل ہڑپ کر جائے یعنی (Freedom at the cost of equality) نہ ہولویہ نہ ہی مساوات کا ہوّا اتنا بڑھ جائے کہ وہ آزادی کو بالکل نگل جائے یعنی Equality at the cost of freedom ——— بھی نہ ہو۔ اسلام کا مرکزی تصور عدل ہے اور وہ اس عدل کو ہر گوشہ زندگی میں نافذ کرنا چاہتا ہے۔

قیامِ عدل وقسط کی اہمیّت

انسانی اجتماعیات کے بہت بڑے عالم اور جدید معاشرتی اور سماجی مسائل کی طرف دو صدی قبل توجہ دلانے والے، اور ان کا قرآن و حدیث کی روشنی میں حل پیش کرنے والے عظیم مجدّدِ دین امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام میں عدل وقسط کے قیام کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور اس پر انھوں نے بہت عمدہ دلیل قائم کی ہے کہ اسلام یہ عدل اس لیے قائم کرنا چاہتا ہے کہ اگر کوئی جابرانہ اور ظالمانہ (یا جدید اصطلاح میں استحصالی) نظام رائج ہو جائے تو اس کے نتیجے میں آبادی کی ایک عظیم اکثریت بالکل حیوانوں کی سطح پر زندگی بسر کرنا شروع کر دیتی ہے اور اس کے لیے کسی اعلیٰ سوچ، فکر یا خیال کا امکان ہی باقی نہیں رہتا اور اکثریت کو مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ کولھو کے بیل اور باربرداری کے اونٹ کی مانند اپنی دو وقت کی روٹی کے لیے جان گسل محنت میں صبح سے شام تک مصروف رہے تو کہاں اللہ سے محبّت کرنا اس کو چاہنا، اس سے لَو لگا کر بیٹھنا یا کسی اعلیٰ فکر کی طرف متوجہ ہونا۔ گویا اب انسانوں کے لیے اس مقصد کو پورا کرنا ممکن ہی نہیں رہتا کہ جس کے لیے ان کی تخلیق ہوئی تھی۔

بمصداقِ الفاظ قرآنی "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" کہ میں نے جنّوں اور انسانوں کو صرف بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔

لہٰذا اسلام یہ چاہتا ہے کہ نظام عدل وقسط قائم ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں

لہ "مجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے"

کو موقع حاصل ہو کہ اللہ کی معرفت حاصل کریں، اس سے محبت کریں اور اس سے لو لگائیں۔

ان دو مقدمات کے بعد اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

حضرات! اسلام نے معاشی اور اقتصادی معاملات میں عدل و قسط کا جو مقام متعین کیا ہے اور جس میں اس نے مساوات اور آزادی ایسی دونوں اعلیٰ اقدار کو خوبصورتی سے سمویا ہے وہ نظام کیا ہے؟ [۱] میں اس کی طرف آتے ہوئے ایک بات کہنا چاہتا ہوں جو شاید اکثر لوگوں کو چونکا دے اور یہی میں چاہتا ہوں کہ ذہن بیدار ہو جائیں۔ وہ یہ کہ اسلام کا معاشی نظام ایک نہیں دو ہیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ ازابتدا تا انتہا مکمل ہیں۔ دونوں کا اپنا ایک فلسفہ ہے، دونوں کا ایک نظریہ ملکیت ہے، نظریہ حقوق، نظریہ قدر زائد (Surplus Value) ہے۔ یہ تمام چیزیں وہ ہیں کہ جو کسی بھی معاشی نظام میں بنیادی اہمیت کی حامل ہُوا کرتی ہیں اور یہ سب چیزیں ان دونوں میں بالکل جُدا جُدا ہیں۔ کوئی چاہے تو یُوں کہہ لے کہ یہ دونوں ایک ہی نظام کے دو رُخ ہیں لیکن بہرحال ان کے علیحدہ علیحدہ وجود سے انکار ممکن نہیں۔ یہ دونوں نظام ایک دوسرے سے انٹرکونکٹڈ بھی ہیں، بہت حد تک انٹرڈیپنڈنٹ بھی، اور اسلام کی برکات اور اس کے ثمرات کا کامل ظہور ان دونوں کے اجتماع اور اتصال ہی سے ہو سکتا ہے۔

اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر ان دونوں میں سے ایک پہلو نگاہوں سے اوجھل ہو جائے اور توجہ صرف ایک ہی پر مُرتکز ہو جائے تو اس سے جو تصویر سامنے آئے گی وہ اصل حقیقت سے بہت دُور ہو گی۔ ان میں سے ایک اسلام کا رُوحانی و اخلاقی نظام ہے اور دُوسرا قانونی و فقہی نظام۔ ان دونوں کے تقاضے بسا اوقات مختلف ہی نہیں متضاد ہوتے ہیں۔ تاہم ان دونوں کے

---

[۱] ایک اہم بات یہ پیش نظر رہے کہ قرآن وحدیث میں نظامِ اسلامی یا نظامِ مصطفیٰ کی اصطلاح ہمیں نہیں ملتی۔ اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے اور وہ یہ کہ نظام کوئی جامد شئے نہیں بلکہ ہر دور کی علمی اور معاشرتی سطح کے مطابق نظام وجود میں آتا ہے۔ اس سلسلے میں اسلام کی رہنمائی "ہدایات" اور "حدود" کی صورت میں ہے۔ اسلام نے "حلال اور حرام" کی کچھ حدود متعین کی ہیں جن کی جمع و تدوین سے 'نظام' وجود میں آتا ہے۔

امتزاج سے اسلام کا کامل نظام وجود میں آتا ہے ۔ آپ چاہیں تو ان دونوں پہلوؤں کو "دعویٰ" (Thesis) اور "جواب دعویٰ" (Anti-thesis) سے تعبیر فرمائیں اور ان دونوں کے امتزاج کو synthesis قرار دے لیں ۔ ایک چھوٹی اور سادہ سی مثال سے بات واضح ہو جائے گی ۔ کوئی شخص آپ کے ایک تھپڑ مار دے تو اگر آپ بالکل عاجز وکمزور ہیں تو اس صورت میں "قہرِ درویش بر جانِ درویش" کے سوا اور کوئی صورت قابلِ عمل ہے ہی نہیں ۔ اس کے برعکس اگر آپ بدلہ لینے پر قادر ہیں تو آپ کے سامنے دو راستے کھلے ہیں : ایک یہ کہ آپ بدلہ لے لیں اور دوسرے یہ کہ آپ معاف کر دیں ۔ اس صورت میں ایک جانب اسلام کا قانونی اور فقہی نظام بدلے اور قصاص کی حوصلہ افزائی کرتا ہے ۔ چنانچہ قرآن حکیم فرماتا ہے : وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓا أُولِي الْأَلْبَابِ (البقرہ۔ ۱۷۹) لیکن دوسری طرف اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام ہے جو عفو و درگزر کی تلقین کرتا ہے ۔ یعنی اگر معاف کر دو تو یہ تقویٰ اور خدا ترسی سے قریب تر ہے ۔ چنانچہ شوق اور رغبت دلانے کے انداز میں فرمایا جاتا ہے : وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ (آل عمران ۱۳۴) یعنی وہ لوگ جو غصّہ کو پی جائیں اور لوگوں کو معاف کر دیا کریں ۔ دیکھ لیجیے کہ عفو و قصاص ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی معاشرہ ان دونوں میں سے صرف ایک پر استوار ہو سکتا ہے ۔ دونوں اپنے اپنے مقام پر لازم و ناگزیر ہیں اور حُسنِ معاشرت ان دونوں کے امتزاج ہی سے وجود میں آتا ہے ۔

اس پر قیاس کر کے سمجھ لیجیے کہ اسلام کے معاشی نظام کے بھی دو پہلو ہیں، چنانچہ ایک جانب قانونی اور فقہی نظامِ معیشت ہے جس کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ یہ ایک نوع کی محدود سرمایہ داری (Controlled capitalism) ہے، اس لیے کہ اس میں انفرادی سرمایہ کاری کی اجازت موجود ہے ۔ اگرچہ اسے "سرمایہ دارانہ نظام" بننے سے بعض تحدیدی اقدامات نے روک دیا ہے ۔ دُوسری طرف اسلام کا روحانی و اخلاقی نظامِ معیشت ہے جس کے بارے میں مَیں پُورے انشراحِ صدر سے عرض کرتا ہوں کہ وہ ایک نہایت اعلیٰ قسم کی روحانی اشتراکیت (Spiritual socialism) ہے اور ایک ایسا کامل سوشلزم ہے کہ اس کے آگے

کا تصوّر بھی ممکن نہیں ۔ اس لیے کہ سوشلزم یا کیمونزم میں تو پھر بھی انسانی ملکیت کا اثبات موجود ہے اگرچہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی، لیکن اسلام اپنی اخلاقی و روحانی اور صحیح تر الفاظ میں "ایمانی تعلیم" کی رُو سے انسانی ملکیت کی کلّی نفی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں بار بار یہ الفاظ آتے ہیں کہ "لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ" آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس سب کا مالک صرف اللہ ہے۔ انسان کسی اور شَے کا مالک تو کیا ہوگا خواہ وہ زمین ہو، مکان ہو، سازوسامان ہو، روپیہ پیسہ ہو، وہ تو خود اپنا اور اپنے وجود کا مالک بھی نہیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں، اعضاء و جوارح اور جسم و جان اور اس کی کُل توانائیاں سب اللہ کی ملکیت ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں ان کا امین ہوں۔ بقول شیخ سعدیؒ ؎

ایں امانت چند روزہ نزد ما ست در حقیقت مالک ہر شَے خدا ست

یا بقول علامہ اقبال مرحوم

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست ایں متاعِ بندہ و ملکِ خدا ست

اس اعتبار سے بھی ہمارے ہاں بڑی کینفوژن پائی جاتی ہے۔ سوشلسٹ ذہن رکھنے والے اہلِ قلم ایسی آیات اور احادیث کو اکٹھا کر کے ہر شے کی ملکیت کی کامل نفی کرتے چلے ہیں اور ضرورت سے زائد اپنے پاس رکھنے کی بھی، کہ جب "قُلِ الْعَفْوَ"[1] فرما دیا گیا تو زائد چیز جبراً بھی وصول کر لی جائے گی۔ اس طرح وہ ایک کامل اسلامی سوشلزم کا نقشہ پیش کرتے ہیں؛ جب کہ وہ دوسرے پہلو کو بالکل نظرانداز کر دیتے ہیں۔ حالانکہ قانونِ وراثت بھی اسی قرآن میں موجود ہے، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نظام برپا کیا تھا اس میں کہیں جبری مساوات دکھائی نہیں دیتی۔ بلکہ اس کے برعکس آزاد معیشت کے مواقع دیے گئے تھے کہ محنت کرو اور جائز ذرائع سے کماؤ اور ان ذرائع سے تم جو کچھ کماؤ گے اس پر تمہارا حقِ تصرّف (جو بہت قریب ہو جاتا ہے حقِ ملکیت کے) یہاں تک تسلیم کیا جائے گا کہ اس کو وراثتاً منتقل بھی کیا جا سکے۔ دوسری طرف ہمارے ہاں بعض مفکرین اور اصحابِ قلم نے صرف اس قانونی نظام کو اتنا نمایاں کیا ہے کہ

[1] جتنا ضرورت سے زائد ہے اللہ کی راہ میں دے ڈالو۔ (البقرہ: ۲۱۹)

دوسرا پہلو دب گیا ہے یعنی "قل العفو" کی آیت ان کی تقریر و تحریر میں نہیں آتی۔
یاد رہے کہ یہ کنفوژن (الجھن) پورے خلوص کے ساتھ محض غلط فہمی کی بنیاد پر بھی ہوسکتی ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ یہ غلط فہمی ہمارے دورِ اول یعنی خلافتِ راشدہ کے دوران بھی پیدا ہو گئی تھی، مثلاً حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غلبۂ زہد کے باعث یہ رائے قائم کی کہ ضرورت سے زائد اشیائے صرف اور کسی بھی مقدار میں سونا اور چاندی اپنے پاس رکھنے کی اجازت نہیں۔ آپ نے آیۂ کنز[1] کو بالکل اس کے ظاہری الفاظ پر محمول کیا۔ خلافتِ راشدہ کے اس نظام میں جس پر تمام امت جمع تھی اس رائے کو ایک انتہائی موقف قرار دیا گیا اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں انھیں مدینہ منورہ سے باہر چلے جانے کی ہدایت بھی کی گئی۔ ایک بیابان میں انھوں نے جھونپڑا ڈالا اور وہیں ان کا انتقال ہوا[2]۔ یہ نظامِ اسلامی کا وہ رُوحانی پہلو ہے جس کی طرف اسلام انسانوں کو ترغیب دینا چاہتا ہے، یہی وہ راستہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنے تزکیہ اور رُوحانی مراتب کے حصول کے لیے آگے بڑھ سکتا ہے۔ اسلام کے ساتھ ایمان بھی ہے، اور اس سے اوپر احسان کا درجہ بھی ہے[3]، مگر اس کو قانونی درجہ دے دینا ایک مغالطہ تھا جو حضرت ابوذر غفاری کو پورے خلوص اور اخلاص کے ساتھ لاحق ہوا۔ لیکن آج یہ مغالطہ جان بوجھ کر اور بدنیتی کے ساتھ دیا جا رہا ہے کیونکہ آج تو خلافتِ راشدہ کا نظام پورے کا پورا ہمارے سامنے موجود ہے اور اُمت کے اس اجتماعی فیصلہ کو نظر انداز کرنا بغیر بدنیتی کے ممکن ہی نہیں۔

---

[1] سورۃ التوبہ ۹: ۳۴

[2] حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے احساس کا یہ عالم تھا کہ وفات کے قریب آپ رضی اللہ عنہ نے زوجہ محترمہ سے فرمایا کہ تم نے یہ کیا سانپ اور بچھو اپنے گرد جمع کر لیے ہیں تو انھوں نے کہا کہ کہاں ہیں وہ سانپ اور بچھو۔ تو آپ نے معمولی چیزوں جیسے توا، چمٹا اور دیگچی کا حوالہ دے کر کہا یہ نہیں پڑے ہوئے میرے گرد؟ حضرتِ ابوذر کے اسی غلبۂ زہد کی وجہ سے آنحضورؐ نے فرمایا تھا کہ تم میں سے جو چاہے کہ حضرت عیسیٰ کا زہد اپنی آنکھوں سے دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ میرے ساتھی ابوذر کو دیکھ لے۔

[3] حدیث جبریل و سورۃ المائدہ ۵: ۹۳

رُوحانی نظام کے چار اصول

اس روحانی معاشی نظام کے چار اصول ذہن میں پھر مرتّب کر لیجیے ۔

① انسانی ملکیت کی کلی نفی۔

② انسان کو اس دنیا میں جو کچھ ملتا ہے اس کی کمائی نہیں اللہ کا فضل ہے۔ گو دکان پر وہ بیٹھا ہے، کھیت میں ہل اس نے چلایا ہے، محنت اس نے کی ہے، لیکن ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ ملا ہے اس کو اللہ کا عطیہ اور اس کا فضل سمجھے ۔ اگر اسے اپنی محنت کا ثمرہ سمجھو گے تو اس پر اپنا حقِ ملکیت جتاؤ گے لیکن اگر اللہ کا فضل سمجھو گے تو اس میں سے اپنا حق اسی قدر سمجھو گے جس قدر اللہ نے معین کیا ہے ۔

③ انسان کا جائز حق کیا ہے؟ صرف اس کی ضروریات کے بقدر، ان کو بھی بعض احادیث میں متعین کر دیا گیا ہے ۔

الف : اگر دو وقت کھانے کے لیے مل گیا ہے ۔

ب : سر چھپانے کے لیے اگر کوئی چھت موجود ہے ۔

ج : پہننے کے لیے اگر دو جوڑے کپڑوں کے موجود ہیں ۔

د : اور اپنے کردار، اخلاق اور عفت کی حفاظت کے لیے اگر ایک بیوی مل گئی ہے ۔

تو تمھارا بنیادی حق تمھیں مل گیا اور اس سے زائد جو کچھ ہے وہ تمھارا نہیں دوسروں کا حق ہے ۔ اس کو پہنچا دو ان تک کہ جن کے پاس نہیں ہے اور پھر سمجھو کہ تم غریبوں کی اس امانت کے بوجھ سے سبکدوش ہو گئے کہ جو امتحان کی غرض سے تمھارے مال میں شامل کر دی گئی تھی اور یہی ہے درحقیقت وہ مقام جہاں تک "قل العفو" کا سارا فلسفہ پہنچانا چاہتا ہے کہ تمھارے پاس جو بھی 'قدر زائد' ہے اس کو مزید کمائی کا ذریعہ نہ بناؤ۔ ضرورت پوری ہو گئی تمھارا حق مکمل ہو گیا، اب جو زائد تمھارے پاس ہے وہ خواہ قانوناً تمھارا ہے مگر حقیقتاً تمھارا نہیں ہے ۔

گویا یہ ایک مکمل نظام ہے، اس میں ملکیت اور قدر زائد اور یہاں تک کہ

اس قدر زائد کا مصرف بھی طے شدہ ہے ۔ اس سلسلے میں سورۃ الرُّوم کی ایک آیۂ مبارکہ ملاحظہ ہو جس میں ربٰو (سُود) کا ذکر بمقابلہ صدقات آیا ہے ۔ فرمایا :

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاْ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (سورۃ الروم-۳۹)

گویا دین کی رُوحانی تعلیم کے اعتبار سے ربٰو درحقیقت صدقہ اور خیرات کے بالمقابل ہے مثال کے طور پر ایک شخص ملازم ہے اس کو تنخواہ ملتی ہے جس سے اس کی ضروریات پوری ہو رہی ہیں اور کچھ سرمایہ اس کے پاس جمع ہو گیا ہے۔اس فاضل سرمایہ کے دو مصرف ہیں، ایک تو یہ کہ اس کو کسی اور کے کاروبار میں لگا کر اس کی محنت کے بل بوتے پر اس سرمایہ کو بڑھائے (وہ خود تو محنت نہیں کرے گا کیونکہ وہ تو کسی اور جگہ ملازم ہے) یہ بھی درحقیقت اس رُوحانی سطح پر ربٰو ہی قرار پائے گا کیونکہ اس روحانی اور اخلاقی سطح پر اس فاضل سرمایے کا مصرف صرف ایک ہے کہ اس کا مالک محتاجوں اور غریبوں کو بنا دیا جائے ۔ یہ ان کو دے دیا جائے کہ جو محروم ہیں ۔ یا جن کے پاس کاروبار کے لیے بنیادی سرمایہ موجود نہیں ہے ۔ گویا فاضل سرمائے کو مزید آمدنی کا ذریعہ بنانا قانونی سطح پر جائز ہے مگر روحانی اور اخلاقی تعلیم میں یہ چیز ممنوعات کی فہرست میں داخل ہے ۔

قانونی اور فقہی نظام

حضرات ! جیسا کہ عرض کیا ہے اسلام کا قانونی اور فقہی نظامِ معیشت ایک طرح کے کنٹرولڈ کیپیٹلزم سے مشابہ ہے ۔ اس میں تمام فطری تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے ۔ اس کی رُو سے انسان کو اپنے مال پر حقِ تصرّف حاصل ہے۔[1] عام حالات میں صرف زکوٰۃ کی حد تک اس سے جبراً وصول کیا جائے گا، باقی اگر وہ شوق سے چاہے تو اللہ کے راستے میں خرچ کرے اور خیر کمائے ۔ لیکن اس کو اس بات کا قانونی حق حاصل رہے گا کہ اپنی ضرورت سے زائد مال کو کاروبار میں لگائے اور اس کو وراثتاً منتقل بھی کرے ۔ یہ تمام چیزیں وہ ہیں کہ جو کسی سرمایہ دارانہ نظام میں

[1] اس میں خاص حالات میں استثنا ممکن ہے جس کی تفصیل بعد میں آئے گی ۔

پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اسلام نے اس قانونی نظام کو بھی ایک حد کے اندر رکھا ہے تاکہ یہ آزاد سرمایہ کاری، سرمایہ داری کی لعنت کی صورت اختیار کر کے انسانی معاشرے پر مسلّط نہ ہونے پائے۔ اس ضمن میں اسلام نے جو عملی تدابیر اختیار کی ہیں ان کو ان کے فلسفیانہ پس منظر سمیت دو حصّوں میں سمجھا جا سکتا ہے۔

الف : یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جب آزادی (خواہ وہ تھوڑی ہی کیوں نہ ہو) دی جائے گی تو کچھ اُونچ نیچ لازماً پیدا ہو گی۔ دوڑ لگے گی تو یقیناً کچھ لوگ آگے نکل جائیں گے اور کچھ پیچھے رہ جائیں گے۔ آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے اس فرق و تفاوت سے بچنا ممکن نہیں۔ آزادی خواہ کتنی ہی محدود کیوں نہ ہو، جب بھی آئے گی اس بات کا امکان بہرحال موجود رہے گا۔ چنانچہ اس کو کھُلے دل سے تسلیم کرنا ضروری ہے۔ لیکن اسلام کے قانونی نظامِ معیشت میں اس بات کا اہتمام بھی کیا گیا ہے کہ معاشرے میں مالی فرق و تفاوت کو کم کیا جائے۔ اس کے لیے اسلام نے زکوٰۃ کا نظام قائم کیا ہے۔ اسلام نے ایک حد قائم کی ہے کہ جو لوگ اس سے اُدھر نکل جائیں دینے والے یا Haves ہیں اور اِدھر والے "لینے والے" یا Recipients ہیں۔ ان کو Have-nots شمار کر لیجیے اور اُن کو دین کی اصطلاح میں وہ علی الترتیب "صاحبِ نصاب" اور "مسکین" کہلاتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ تقسیم بھی اللّ ٹپ (Arbitrary) نہیں ہے۔ اسے آپ اپنے اختیار سے آگے پیچھے نہیں کر سکتے۔ یہ ایک لائن ہے جو کھینچی جا چکی ہے، جس کے پاس اتنے اونٹ ہیں اِدھر اور جس کے پاس نہیں ہیں اُدھر۔ اگر اس قدر سونا ہے تو اِدھر اور نہیں ہے تو اُدھر۔ اور اسی طرح جس کے پاس اتنی چاندی ہے اِدھر اور جس کے پاس نہیں ہے اُدھر۔ اس تقسیم کے بعد وہ نظامِ زکوٰۃ قائم کیا کہ جس کے بارے میں واضح فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "تؤخذ من اغنیائھم وترد الی فقرائھم" ان کے اغنیاء سے مال وصول کیا جائے گا اور ان کے فقراء کو دے دیا جائے گا۔ تاکہ معاشرے میں پیدا ہونے والی ناہمواری کا سدِّباب ہو۔ اور ایسا نہ ہو کہ کچھ لوگ بھوکے اور ننگے رہ جائیں اور ان کی بنیادی ضرورتیں بھی پوری نہ ہوں جبکہ کچھ لوگ اتنا سرمایہ جمع کر لیں کہ کیفیت وہ ہو جائے جس کے بارے میں سورۃ الحشر میں متنبہ فرمایا گیا ہے (کہ سرمایہ صرف تم میں سے صاحبِ ثروت

لوگوں کے درمیان ہی گردش میں نہ رہ جائے جس کی ایک سادہ مثال ایک کروڑ پتی کی بیٹی کا لاکھوں روپے کا جہیز لے کر دوسرے کروڑ پتی کے گھر جانا اور کسی امیر کے بیٹے کی سالگرہ پر امراء کا لاکھوں روپے تحائف کا انبار لگانا ہے۔ اس میں بظاہر سرمایہ گھومتا ہے مگر صرف اغنیاء کے دائرے میں۔ یہ معاشی چکّی صرف وہیں گھوم رہی ہے اور اس کا آٹا چھلنی سے چھن کر نچلے طبقوں تک نہیں پہنچ رہا۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ کسی معاشرے میں یا کسی ملک میں جو بھی ذرائع پیداوار اللہ نے تخلیق فرمائے ہیں ان سے جو کچھ بھی حاصل ہو، اس کی ایک منصفانہ تقسیم ہو۔ معاشرے کے تمام افراد پیداوار اور دولت سے متمتع ہوں اور گردشِ دولت صرف بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ کا مصداق نہ بنے۔

میں جس مفہوم کی ادائیگی کے لیے "کنٹرولڈ کیپٹلزم" کی اصطلاح استعمال کر رہا ہوں آجکل اس مفہوم کو Internally managed capitalism کے الفاظ سے ادا کیا جا رہا ہے۔ سرمایہ دار بھی اس بات کو جان چکے ہیں کہ ننگے اور عُریاں کیپٹلزم کا کوئی مستقبل نہیں۔ وہ تباہی اور بربادی کی طرف جا رہا ہے۔ بقول علّامہ اقبال مرحوم ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

لہٰذا خود کیپیٹلزم اپنے اندر کچھ نمایاں تبدیلیاں کر رہا ہے۔ اس کی بہت نمایاں مثال آپ کو برٹش سسٹم میں ملے گی۔ مثلاً جو لوگ کام پر نہیں ہیں ان کو نان ایمپلائمنٹ الاؤنس دیا جائے یا ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت ریاست اپنے ذمّے لے۔ چنانچہ آزاد معیشت بھی ہے کہ جو آگے نکل سکتے ہیں نکلیں۔ لیکن ہر شہری کے لیے اس کی بنیادی ضروریات کی فراہمی حکومت کی ذمّہ داری ہے۔ غور کیجیے کہ اسلام کے نظام میں یہ چیزیں چودہ سو سال پہلے آچکی تھیں۔ اس ذمّہ داری کا اندازہ حضرت عمرؓ کے اس تاریخی جملے سے لگایا جا سکتا ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ "اگر دجلہ اور فرات کے کنارے کوئی کُتا بھی بھوک سے مر گیا تو عمر سے

اس کے بارے میں بھی بازپُرس ہوگی"۔ (انسان تو بہرحال اشرف المخلوقات ہے اس کا حق جانوروں سے مُقدّم ہے) اسلام آزادی دیتا ہے کہ کماؤ اور کھاؤ، جائز حدود کے اندر اندر خوب محنت کرو۔ کوئی آگے بڑھ جائے اور کوئی پیچھے۔ لیکن یہ معاملہ ایک حد کے اندر اندر رہے اور جو پیچھے رہ جائیں ان کی بنیادی ضروریات کی ضمانت کے لیے زکوٰۃ اور عشر کا نظام قائم کیا گیا۔ کوئی چاہے تو اس کو اجتماعی انشورنس کا نام دے لے۔ اگرچہ اس میں ایک فرق ہے۔ انشورنس کسی بھی نوعیت کی ہو اس کو انسان اپنی کمائی میں سے خرچ کر کے کماتا ہے جبکہ زکوٰۃ اور عشر کے ذریعے سے جو انشورنس اسلام فراہم کرتا ہے اس میں Beneficiary کا کوئی Contribution نہیں ہے، اس کے ادا کرنے والے صرف اغنیاء ہیں۔

ب: اسلام نے مساکین اور صاحبِ نصاب لوگوں کے مابین فرق و تفاوت کو کم کرنے کے لیے صرف زکوٰۃ کے نظام پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس آزاد سرمایہ کاری پر حلال و حرام کی وہ حدود و قیود قائم کی ہیں کہ جن کی موجودگی میں واقعتاً "سرمایہ کاری" "سرمایہ داری" نہیں بن سکتی۔ ذرا نگاہ ڈالیے ان اقدامات پر اور قرآن مجید کی حکمتِ بالغہ پر عش عش کیجیے کہ بغیر معاشیات کا کوئی عنوان قائم کیے کیسی بنیادی اور اہم ہدایات دی ہیں۔

دُنیا میں ہمیشہ سرمایہ اور محنت کے امتزاج ہی سے معاشی نتیجہ نکلتا ہے۔ ایک چھوٹا سا خوانچہ بھی اگر آپ لگائیں تو آپ کو بیس تیس روپے کا مال لگا کر بیٹھنا ہوگا۔ یہی حال بڑی دکان کا ہے یہاں تک کہ کارخانہ اور مل بھی جو کچھ پیدا کرتے ہیں سرمایہ اور محنت کے امتزاج ہی سے پیدا کرتے ہیں۔ گو جدید ماہرینِ اقتصادیات خصوصاً سوشلسٹ مصنّفین نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ سرمایہ بھی محنت ہی کی پیداوار ہے لیکن یہ بحث درحقیقت مُرغی اور انڈے کی نوعیت کی ہے کہ ان میں سے کون سی شئے پہلے ہے۔

بہرحال یہ امر مسلّم ہے کہ اسلام کے نظامِ معیشت میں زیادہ زور محنت پر ہے اور اسے زیادہ سے زیادہ تحفظ دیا گیا ہے جب کہ سرمائے کی حیثیت

کم سے کم رکھی گئی ہے اور اس کے صرف اپنی ذاتی حیثیت میں Earning agent ہونے کو کم سے کم تسلیم کیا گیا ہے اور اس کی بدترین صورت کہ :

۱۔ سرمایہ صرف سرمایہ ہونے کی حیثیت سے کمائی کا حق دار ہو۔
۲۔ وہ اپنا تحفظ بھی چاہے۔
۳۔ گھاٹے میں شریک نہ ہو۔
۴۔ اور نفع میں بھی ایک معیّن شرح لے رہا ہو۔

یہ چار عناصر سُود یا ربٰو کے جُزوِ لاینفک ہیں جسے اسلام نے حرامِ مطلق قرار دیا ہے۔ اس لعنت کو جس طرح اسلام نے اپنے نظامِ معیشت میں ختم کیا ہے اور جس طرح اس کی جڑ کاٹی ہے اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ قرآن مجید میں شراب اور بدکاری کے ارتکاب جیسے جرائم پر بھی وہ انداز اختیار نہیں فرمایا جو سُود پر کیا گیا ہے۔ کوئی شخص اگر جذبات کی رَو میں بہہ کر کوئی غلطی کر بیٹھا ہے تو اس پر حد تو جاری کی جائے گی لیکن قرآن مجید میں اللہ کا جو غضب اور غصہ سُودی کاروبار کرنے والوں پر بھڑکا ہے کسی اور پر نہیں بھڑکا۔ فرمایا کہ اگر تم سُود کے لین دین سے باز نہیں آتے تو "فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ" (البقرہ) تو سن لو کہ اللہ اور اس کے رسول کا تمھارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ اور حدیث میں تو واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے سب سے بڑے رمز شناس حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ ہماری ذہنی سطح سے قریب تر ہے۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا:

الربٰو سبعون جُزءاً ایسرھا ان ینکح الرجل امّہ

(رَواہ ابن ماجہ وبیہقی)

ربوٰ (سُود) کے ستر اجزاء ہیں (یہ گناہ اتنا بڑا ہے کہ اس کے ستّر حصے کیے جا سکتے ہیں) اور ان میں ہلکا ترین بھی اس کے مساوی ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں سے زنا کرے۔

یہ انداز بظاہر کھلتا ہے کہ آپؐ نے یہ اندازِ تعبیر کیوں اختیار فرمایا، لیکن جب میں نے غور کیا تو احساس ہوا کہ واقعہ یہ ہے کہ انسان کو بہت سے گناہوں سے

طبعی نفرت ہے خصوصاً ہمارے ہاں ایک نام نہاد "دیندار" مگر اصلاً "کاروباری" طبقہ ہے۔ ان لوگوں کو نماز روزے سے بڑی دلچسپی ہے۔ حج کرنا تو گویا ان کا محبوب مشغلہ ہے اور دارالعلوم اور مساجد بظاہر قائم ہی انہی کے بل بوتے پر ہیں، شراب سے ان کو بڑی نفرت ہے اور اگر اس پر زنا کا اضافہ ہو جائے تو گویا قیامت آ گئی، مگر سُود سے ان کو کوئی نفرت نہیں اور وہ بڑے ذوق وشوق سے سُودی کاروبار کرتے ہیں۔ لہذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو میزانِ عدل میں تول کر ایک نسبت و تناسب قائم فرمایا ہے اور واضح فرما دیا ہے کہ اس کی اصل حیثیت کیا ہے یعنی معاشرتی بُرائی ہونے کے اعتبار سے یہ زنا کی بدترین صورت (یعنی ماں کے ساتھ زنا) سے بھی ستر گُنا زیادہ بھیانک ہے۔

بالکل اسی نوعیت کا ہے وہ انداز جو سُورۃ الحجرات میں غیبت کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے غیبت کرنے کو اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا گیا ہے کہ جس طرح ایک مُردہ اپنا دفاع نہیں کر سکتا، جیسے چاہو نوچ ڈالو، اسی طرح تمہارا جو بھائی موجود نہیں وہ بھی اپنی مدافعت سے قاصر ہے جیسے چاہو اس کی برائی کر لو۔

فی الجملہ ہمارے نظامِ شریعت میں اور احکامِ دین کے اس پورے سلسلے میں جو بدترین بُرائی قرار دی گئی ہے وہ سُود ہے۔

اصل میں یہی وہ چیز ہے جس پر سرمایہ داری پروان چڑھتی ہے اور ہمارے دین میں اس کی جڑ کاٹ دی گئی ہے۔

کاروبار کی وہ صورتیں جو مطلقاً حرام ہیں

سرمایہ جب اپنے بل بوتے پر مارکیٹ کو کنٹرول کرتا ہے اور مارکیٹ میں اتار چڑھاؤ پیدا کرتا ہے، مثلاً ایک شخص سرمایہ کی بنیاد پر کبھی ایک دم بہت سا مال خرید کر قیمتیں بڑھا دیتا ہے اور مارکیٹ کو اونچا لے جاتا ہے اور کبھی ایک دم بہت سا مال ریلیز (Release) کر کے مارکیٹ کے بھاؤ گرا دیتا ہے تو یہ سرمائے کا کھیل بلکہ

ننگا ناچ ہے ۔ مارکیٹ میں اس کے جتنے بھی ذرائع ہیں ان کو دینِ اسلام نے حرام مطلق قرار دیا ہے۔ مثلاً :

① ذخیرہ اندوزی (HOARDING)

اس سلسلے میں سب سے زیادہ زور اشیاءِ خورد (Eatables) پر دیا گیا ہے کیونکہ یہ انسان کی سب سے زیادہ بنیادی ضرورت ہیں۔ اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے باقی اشیائے ضرورت کو بھی ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ذخیرہ اندوزی کے بارے میں ارشاد فرمایا :

"جس نے کھانے پینے کی چیز چالیس دن تک روک کے رکھی (بازار میں مانگ ہے مگر وہ اس کو فراہم نہیں کر رہا، چاہتا ہے کہ قیمتیں بڑھ جائیں) تو وہ اللہ سے بری ہو گیا اور اللہ اس سے بری ہو گیا اللہ کا کوئی تعلق اس سے نہیں اور اس کا کوئی تعلق اللہ سے نہیں"

② سٹہ (SPECULATION

کچھ لوگوں کی ایک معاشی حیثیت متعین ہے اور وہ سٹہ کھیلتے ہیں اور بیٹھے بٹھائے مال کے خرید و فروخت کا چکر چلاتے رہتے ہیں حالاں کہ وہ نہ بالفعل مال خریدتے ہیں اور نہ بیچتے ہیں اور نتیجتہً مارکیٹ میں آنے سے قبل ہی مال پر منافعے کی تہیں چڑھتی چلی جاتی ہیں ۔ یہ تمام پیشگی فرضی سودے سرمایہ داروں کا ایک کھیل ہیں، اس کے سوا کچھ نہیں ۔ ہمارے دین میں جو مال موجود نہ ہو اس کا سودا نہیں ہو سکتا سوائے ایک استثنائی صورت کے جسے 'بیعِ سَلَم' کہا جاتا ہے ۔

③ انشورنس (INSURANCE)

میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مختلف چیزوں کی حقیقت کو سمجھیں۔ بقول علّامہ اقبال

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

بعض چیزیں دیکھنے میں بہت خوشنما نظر آتی ہیں لیکن حقیقت میں وہ بھی اسی نوعیت کی ہیں کہ جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ۔ انھی میں ایک انشورنس ہے ۔ ہم کسی درجے میں یہ تو جانتے ہیں کہ ہمارے دین میں یہ شئے حرام ہے ۔ اس کی حُرمت کی

حکمت سمجھیے کہ اس حرمت سے کس طرح سرمایہ کاری (جس کی اسلام میں اجازت ہے) کو سرمایہ داری بننے سے روکا گیا ہے۔

انشورنس کیا ہے؟

اوّل تو اس میں چانس والا جوئے کا پہلو ہے لیکن اس سے پہلے اس کی اصلیت ہی سرمایہ دارانہ ہے۔ اصل انشورنش تو وہ ہے جو بڑی بڑی فیکٹریوں اور کارخانوں کی ہوتی ہے[1]۔ ایک سرمایہ دار نے دس لاکھ روپے کے سرمائے سے ایک کارخانہ بنایا، فرض کیجیے وہ ایک ماچس کی فیکٹری لگاتا ہے۔ اس کا یہ کارخانہ آفاتِ سماویہ کی زد میں ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی سیلاب آجائے یا کسی اتفاقی حادثہ میں آگ لگ جائے اور سارا کارخانہ جل کر راکھ ہو جائے، لیکن وہ سرمایہ دار اپنے سرمایہ کا تحفظ چاہتا ہے انشورنس کے ذریعے سے۔ لیکن وہ یہ تحفظ بھی اپنی جیب سے نہیں کرتا۔ اس کے لیے وہ جو پریمیم (Premium) ادا کرتا ہے اس کو اپنے اخراجات میں داخل کر کے دیاسلائی کی لاگت (Cost) میں شامل کرتا ہے اور دیاسلائی کی ڈبیہ کی قیمت اگر ۲۵ پیسے ہے تو اس میں ایک پیسہ یا کم وبیش وہ سرمایہ دار صارف (Consumer) سے اپنے سرمائے کے تحفظ کے لیے وصول کر رہا ہے۔ یہ ذہن میں رہے کہ قومی معیشت کے اعتبار سے تباہی ہو گئی، ملکی سطح پر دس لاکھ روپے کا نقصان تو ہو گیا لیکن وہ سرمایہ دار اس قومی نقصان سے لاتعلق رہنا چاہتا ہے۔ وہ صارف کی کاسٹ پر اپنے سرمایہ کا تحفظ کرتا ہے اور اپنے مستقبل کا بھی۔ وہ یہ تحفظ عوام کی جیبوں پر بوجھ ڈال کر کرتا ہے۔ یہ ہے اصل حقیقت انشورنس کی۔ گویا یہ فی الحقیقت سرمایہ داروں کی ایک کوآپریٹو ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہ صرف سرمایہ داروں کے سرمائے کا تحفظ ہے۔ اور "كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ" کی جیتی جاگتی تصویر۔ یہ سرمایہ داری کی لعنت کو تقویت پہنچانے والی شے ہے، جس کی حرمت کا اسلام نے فیصلہ صادر فرما دیا ہے۔

---

[1] لائف انشورنس کے حق میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اس میں سے جُوئے کا پہلو نکال دیجیے تو وہ اتنی سخت چیز نہیں رہتی لیکن حرمت کا پہلو بہرحال ہے۔ میں اس کا قائل ہوں۔

معیشت کی ناپسندیدہ یا مختلف فیہ صورتیں

اب تک تو میں نے وہ چیزیں بیان کی ہیں جو حرام قطعی ہیں۔ تھوڑا سا نیچے آئیے تو ہمارے دین میں ایک اور دائرہ ہے جس میں اسلام نے کچھ چیزوں کو یا تو حلال رکھا ہے یا یہ کہ ان کی حلت و حرمت میں اختلاف ہے لیکن رُوحِ دین کے اعتبار سے ناپسندیدہ ہیں۔ ان سب کو میں ایک ہی گروپ میں لا رہا ہوں۔

الف: مضاربت :

ایک شخص محنت کر سکتا ہے، دکان چلا سکتا ہے، مگر اس کے پاس سرمایہ نہیں ہے اور کسی دوسرے شخص کے پاس زائد سرمایہ موجود ہے۔ اب یہ دونوں مل کر کام کرتے ہیں، ایک کی محنت ہوگی دوسرے کا سرمایہ۔ اس صورت میں محنت اور سرمایہ کا امتزاج[1] وجود میں آئیگا اور اس کا نام مضاربت ہے۔ یہ دین میں جائز تو ہے مگر پسندیدہ نہیں جیسے مثلاً طلاق[2]۔ اگر کسی کے پاس سرمایہ ہی اتنا ہے کہ جس پر خود اس کی معیشت کا دارومدار چل سکتا ہے تو وہ خود دکان لگائے، محنت کرے اور رزق حلال کمائے۔ لیکن اگر کسی شخص کے پاس اپنی ضروریات کے لیے کوئی اور ذریعہ موجود ہے اور وہ فاضل سرمایہ اپنے ایسے بھائی کو دے رہا ہے جو سرمایہ نہ ہونے کے باعث کسی اور کے سرمائے پر کام کرنے پر مجبور ہے لیکن یہ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے سرمائے کی بنیاد پر اس کی محنت میں حصے دار بنتا ہے۔ یہ جائز تو ہے کیونکہ اگر کسی بھی درجے میں آزادی کو برقرار رکھنا ہے تو اس نظام میں یہ گنجائش تو رکھنا پڑے گی۔ لیکن اسلام اس کو بس مجبوراً جائز قرار دیتا ہے۔ جبکہ اس کے نزدیک پسندیدہ چیز وہی ہے جس کا ذکر اخلاقی نظام کے تحت "قل العفو" کے حوالے سے گزر چکا ہے۔ لیکن اس میں بھی دیکھیے کہ اسلام نے کس مضاربت کو جائز قرار دیا ہے۔ ہمارے ہاں جو

---

[1] امتزاج کی ایک صورت مشارکت بھی ہے کہ دو آدمی مل کر کاروبار کرتے ہیں دونوں سرمایہ بھی لگاتے ہیں اور دونوں محنت بھی کرتے ہیں تو اس میں کوئی قباحت سرے سے ہے ہی نہیں۔

[2] ابغض الحلال عند الله الطلاق (الحدیث) "جائز کاموں میں اللہ کے نزدیک سب سے مکروہ شے طلاق ہے۔"

مضاربتیں ہوتی ہیں ان پر قیاس نہ کیجیے۔ لفظ مضاربت کے اشتراک سے یہ نہ سمجھ لیجیے کہ اس نام سے جو کچھ ہے وہ جائز ہے۔ اسلام جس مضاربت کو جائز قرار دیتا ہے اس میں محنت کو پورا پورا تحفظ دیا گیا ہے، جبکہ سرمائے کو کوئی تحفظ نہیں دیا گیا۔ اگر نفع ہوگا تو محنت کرنے والے کو اس میں سے حصّہ ملے گا، لیکن اگر گھاٹا ہوگا تو اس کا کوئی بوجھ محنت کش پر نہیں پڑے گا۔ نقصان کا سارا بوجھ سرمایہ دار کو برداشت کرنا ہوگا۔

یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھیئے۔ قرآن مجید میں جہاں تجارت کا ذکر آتا ہے وہاں 'عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ'[1] (کہ وہ تجارت باہمی رضامندی سے ہو) کی شرط عاید کرتا ہے۔ اگر آپ کوئی شے خریدنے بازار گئے ہیں، آپ کو اس کا بھاؤ معلوم ہے آپ قیمت دے کر چیز خرید لیں گے اور معاملہ رضا و رغبت کا ہوگا' لہذا وہاں یہ شرط پوری ہو جائے گی۔ لیکن کوئی ایسا معاملہ جس میں کوئی شخص بالکل مجبور ہو' گو قانونی طور پر تو رضامندی ہو گئی، آپ کہیں گے کہ میں نے کب اس کو مجبور کیا تھا وہ خود میرے پاس آیا ہے کہ میرے پاس سرمایہ نہیں ہے تم مجھے سرمایہ دو۔ میں محنت کر لوں گا اور تمھیں اس میں سے حصّہ دوں گا۔ کہنے کو تو رضامندی ہوگئی لیکن درحقیقت یہ مجبُوری ہے کیونکہ اس کے پاس اپنا سرمایہ نہیں۔ اگر ہو تو کوئی کب پسند کرتا ہے کہ کسی اور کو اپنی محنت کے حاصل میں شریک کرے۔ چنانچہ مجبوری کا پہلو اس مضاربت میں موجود ہے جس کی وجہ سے اگرچہ یہ حلال تو ہے مگر پسندیدہ نہیں ہے۔

ب۔ مزارعت :

اسی قبیل کی شے مزارعت ہے۔ ایک شخص کی زمین ہے اور کوئی دُوسرا اس پر محنت کر رہا ہے۔ اس مسئلہ میں فقہائے اُمت کے درمیان اختلاف ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر قسم کی مزارعت حرام مطلق ہے۔ Absentee Landlordism کا ان کی رائے میں اسلام میں کوئی امکان سرے سے موجود نہیں ــــ بعض دوسرے فقہاء نے ان احادیث پر غور کرنے کے بعد

---

[1] سُورۃ النساء آیت ۲۹

اس میں استحسان اور مصالح مرسلہ کے اصول کے تحت کچھ گنجائشیں نکالی ہیں اور یہ بھی میں سمجھتا ہوں کہ چونکہ اُس دَور کے خاص حالات میں ایک موجود الوقت نظام کو کلیتہً بدلنا ممکن نہ تھا، لہذا کچھ ناگزیر شرائط کے ساتھ ان کی گنجائش پیدا کی گئی تھی، ورنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مزارعت پر لفظ ربٰو کا اطلاق کیا ہے، کہ جب آپؐ نے حضرت رافعؓ ابن خدیج کو دیکھا کہ وہ ایک کھیتی کو سینچ رہے ہیں۔ آپؐ کے علم میں تھا کہ رافع کی اپنی کوئی زمین نہیں، لہذا آپ نے ان سے تفصیل پوچھی۔ حضرت رافع نے بتایا کہ زمین فلاں شخص کی ہے اور محنت میں نے کی ہے اور ہمارے مابین یہ شرح مقرر ہوئی ہے۔ اِس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قد اَرْبیتما" یعنی تم نے رِبٰو کا معاملہ کیا، ایک سُودی کاروبار کیا۔ اور فرمایا کہ زمین اس کے مالک کو لوٹا دو اور جو خرچ تمھارا اس پر آیا ہے اس کی قیمت اس سے وصول کر لو۔ اس لیے کہ اس میں مالک کی محنت شامل نہیں ہو رہی ہے، وہ صرف زمین کی ملکیت کی بنیاد پر اپنے ایک بھائی کی گاڑھے پسینے کی کمائی میں سے حصہ وصول کرنا چاہتا ہے۔

ہمارے ہاں مزارعت کی جو شکلیں رائج ہیں اس میں پھر بھی مالک بیج اور بہت سی دوسری چیزوں میں شامل ہوتا ہے، یہ اس حرام کو حلال بنانے کے لیے کچھ اضافی شرائط عائد کی گئی ہیں۔ ورنہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ آنکھیں کھول دینے کے قابل ہے۔ مجھے امام صاحب کی اس رائے سے کاملتہً اتفاق ہے۔

خرید و فروخت کے مروجہ طریقوں پر قدغنیں

جو مال موجود نہ ہو اس کے سودے کی جو شکل بھی ہو وہ حرام ہے مثلاً:

---

[1] یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ جب ہماری اکثریت امام ابوحنیفہؒ کی فضیلت بیان کرتی ہے تو ان کو امام اعظم اور سید الفقہاء قرار دیتی ہے اور ان کے بعض فتاویٰ کو درست ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا ہے۔ مگر "میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو" کے مصداق ایسے اہم معاملات پر ان کے فتوے کو سرے سے کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔

(۱) ٹھیکے پر زمین دینا۔ مالک نے ایک وقفے کے لیے زمین کی قیمت وصول کرلی ہے۔ اب کاشت کار کو اس سے کوئی بچت ہوتی ہے یا نہیں، اس کو اس سے کوئی بحث نہیں۔ گویا یہ تو کھلی ہوئی سود کی صورت ہے۔ اس لیے یہ حرام ہے۔

(۲) باغ میں پھل آنے سے قبل اس کا سودا کرنا بھی ناجائز ہے۔

(۳) یہ تمام ایڈوانس بزنس (Advance Transactions) جو دنیا میں ہوتے ہیں ان کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ سیدھی سادھی بیع وہ ہے کہ قیمت دو اور مال وصول کرو یا ایک ہاتھ سے چیز لو اور دوسرے ہاتھ سے دو۔ تبادلے کی صورت میں یہاں بھی کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا مقصود نہ ہو۔ ذخیرہ اندوزی یا کوئی اور مفاد پیش نظر نہ ہو۔ ایڈوانس بزنس کے اس طریقے کے باعث Over Trading ہوتی ہے ایک شخص کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں لیکن وہ پچاس ہزار روپیہ بیعانہ ادا کرکے پچاس لاکھ کے سودے کر لیتا ہے تو اس سے سرمایہ داری کی لعنت جنم لیتی ہے۔ اس کو روکا گیا ہے کہ اگر تمھارے پاس پانچ لاکھ روپیہ ہے تو پانچ لاکھ ہی کا سودا کرو۔ اسلام میں ادھار کی صرف ایک صورت جائز ہے جس کو بیع سلم کہتے ہیں کہ ایک طرف سے پوری جنس یا قیمت ادا کر دی جائے اور دوسری طرف سے مال کی فراہمی یا ڈلیوری کو موخر (Defer) کیا جا سکتا ہے لیکن آجکل جزوی ادائگی کے جتنے بھی سودے کیے جا رہے ہیں ان کی شریعتِ اسلامی میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(۴) **آڑھت :**

اسی کے ضمن میں آڑھت آتی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"لا یبیع الحاضر للبادی"

کوئی شہر کا آدمی باہر کے آدمی کا مال فروخت نہ کرے۔

یہ آڑھتی جو منڈیوں میں اڈے جما کر بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ مال جو یہ بیچتے ہیں ان کا اپنا نہیں ہوتا اور کئی دفعہ مال موجود بھی نہیں ہوتا۔ وہ صرف اپنے اڈے کی وجہ سے فروخت کنندہ اور گاہک دونوں سے کمیشن وصول کرتے ہیں۔ ایک شخص

نے گندم بوئی ہے تو وہ خود فروخت کرے اور اگر اس شہر والے کے پاس گندم کی قیمت موجود ہے تو پہلے پوری گندم خرید لے اور پھر اپنے پاس سے اسے فروخت کرے ۔

اس اعتبار سے دیکھیے کہ یہ کس قدر دُور رَس ہدایت ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے ورنہ ہمارے ہاں اجناس کی قیمتوں کو بڑھانے والے اور گوشت کی قیمتوں کو چڑھانے والے یہ آڑھتی ہیں ۔ لہذا اسلام نے ان کے عمل دخل کو کم کیا ہے ۔

مڈل مین (MIDDLE MAN)

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اسلام نے اپنے معاشی ڈھانچے میں مڈل مین کے عمل دخل کو حتی الوسع کم کیا ہے ۔

تقسیم دولت کے لیے اقدامات

۱ ــــ وراثت : اسلام کا قانونِ وراثت ارتکاز دولت کو ختم کرتا ہے۔ ایک شخص کی جائیداد کا وارث کوئی دوسرا (ایک ہی شخص) نہیں بنتا بلکہ وہ جائیداد اور سرمایہ بٹ کر بہت سے لوگوں کو ملتا ہے ۔

۲ ــــ انفاق فی سبیل اللہ اور نفلی صدقات ۔

انسانی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر دولت کمانا

جس طرح اسلام دولت کمانے کے لیے کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دیتا بالکل اسی طرح انسانی کمزوریوں کو Exploit کر کے دولت کمانے کی بھی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ مثلاً

① جنسی جذبہ (SEX)

جنسی جذبہ انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے ۔میں نے سیکس کو انسان کی کمزوری کہا ہے ۔ قرآن مجید نے بھی انسانی شرمگاہوں کو "فرج" کہا ہے ۔ فرج کے لغوی معنی

ہیں اندیشے کی جگہ۔ فصیل میں جہاں دراڑ ہے وہ فرج ہے جہاں سے غنیم کے در آنے کا یعنی حملہ آور کے اندر داخل ہونے کا موقع ہو۔ لہٰذا انسان کے اس جنسی جذبہ کو مشتعل کر کے کمانے کو حرام مطلق قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح آپ کا یہ ساری فلم انڈسٹری اور قحبہ گری کا کاروبار اور فحش لٹریچر کی طباعت و اشاعت اور خرید و فروخت کا دھندا ختم ہو جاتا ہے۔

⑵ شراب پر پابندی

اسی طرح شراب بھی حیوانی جذبات کو مشتعل کرتی ہے چنانچہ اس کے پینے پلانے اور خریدنے اور بیچنے کو حرام مطلق قرار دیا گیا ہے۔

⑶ فضول خرچی

انسان اکثر و بیشتر دولت کماتا ہے تعیش کے لیے، لیکن اسلام میں عیاشی کے تمام دروازے بند ہیں۔ قرآن مجید میں تبذیر (فضول خرچی اور نمود و نمائش) پر خرچ کرنے سے روکا گیا ہے۔ اور گویا اس طریقے سے بھی اسلام نے دولت کے ساتھ انسان کی محبّت (Attachment) کو کم کر دیا ہے۔ تو پھر کوئی شخص سرمائے کو کیوں چاہے گا۔

قصّہ مختصر سرمایہ داری کی لعنت پر اسلام کا حملہ کسی ایک جانب سے نہیں بلکہ مختلف اطراف سے ہے۔

تو یہ ہے وہ نقطۂ عدل، کہ آزادی بھی برقرار رہے یعنی اسلام میں جبری مساوات نہیں، لیکن اس بات کا معقول انتظام ہے کہ عوام کے درمیان معاشی ناہمواری ایک حد سے بڑھنے نہ پائے۔ رہی وہ جبری اور کلّی مساوات جس کی تعلیم سوشلزم دیتا ہے تو وہ دُنیا میں آج تک کبھی قائم نہیں ہوئی۔ اور فطرتِ انسانی سے بالکل بعید ہے۔

دو گنجائشیں

⑴ ایک طرف اسلام نے اس بات کی گنجائش رکھی ہے کہ اگر کسی وقت زکوٰۃ

اور عشر کی حاصل شدہ آمدنی یا خمس اور اس نوعیت کے دوسرے محصولات مثلاً سفنے وغیرہ سے حاصل شدہ رقوم[1] ایمرجنسی کے حالات میں کفالتِ عامہ کے لیے کافی نہیں ہوتیں تو اسلام غربا اور مساکین کی وکیلِ عام اسلامی ریاست کو حق دیتا ہے کہ وہ زکوٰۃ وغیرہ سے زائد جبراً بھی وصول کرے ۔ یعنی یہ حقِ ملکیت اس طرح کی Sanctity اور اس نوع کا تقدس نہیں رکھتا کہ جو ایک سرمایہ دارانہ نظام میں اس کو حاصل ہوتا ہے ۔

⑵ قومیانا (NATIONALISATION)

دوسری طرف اگر کسی ذریعۂ پیداوار کو پبلک سیکٹر میں رکھتے ہوئے عدل کا تقاضا پورا نہ ہونے پائے تو اسلامی ریاست میں اس ذریعہ پیداوار کو قومیانے (Nationalise) کی گنجائش بھی موجود ہے ۔ کیونکہ اصل شے عدل ہے۔ اگر عدل کا تقاضا پورا نہیں ہوتا تو کسی بھی صنعت وغیرہ کو قومیانے میں کوئی قدغن اسلام کی رُو سے نہیں ہے ۔

اس کی سب سے بڑی دلیل حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اجتہاد ہے ۔ جب عراق کی زمینیں فتح ہُوئیں اور دجلہ اور فرات کی سرزمین اور شام اور فلسطین کے انتہائی زرخیز علاقے اور سبزہ زار مسلمانوں نے فتح کیے تو مطالبہ کیا گیا کہ ان کو مجاہدین کے اندر تقسیم کر دیا جائے ۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس پر غور کیا اور یہ بڑا نزاعی مسئلہ بنا رہا ۔ اس پر بڑی لے دے ہوئی ، مجلس شوریٰ کے اجلاس منعقد ہُوئے ۔ دونوں طرف سے بھرپور دلائل دیے گئے لیکن آخر کار حضرت عمرؓ کے اجتہاد پر اجماع ہُوا کہ ایسا کرنے سے عدل کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے ۔ لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا : سب زمینیں اسلامی ریاست کی ملکیت (سٹیٹ لینڈ) ہوں گی اور اس پر کام کرنے والے (Tenants) مزارعے کی حیثیت سے برقرار رہیں گے ۔ وہیں کے لوگوں کو حقوق دیے گئے اگرچہ وہ ملکیت کے حقوق نہیں تھے لیکن ایک نوع کی موروثی مزارعت تھی کہ وہ ان میں زراعت کریں گے اور اسلامی ریاست ان سے لگان یا خراج وصول کریگی۔ ذہن میں رکھیے کہ اگر خدانخواستہ اس موقع پر حضرت عمرؓ کا یہ اجتہاد سامنے نہ آتا تو دُنیا

---

[1] یہ سب اسلامی ریاست کے محاصل ہیں اور ان سب کا بڑا حصہ وہ ہے کہ جو Have-nots کی کفالت کا ذریعہ بنتے ہیں ۔ اسلامی ریاست میں Taxes کی اجازت ہے ۔

میں بدترین جاگیرداری نظام اسلام کے ذریعے سے رائج ہو جاتا۔ کیونکہ عراق اور شام کے فاتحین کی تعداد محض چند ہزار تھی ——— اور اگر وہ تمام زمینیں ان میں تقسیم کی جاتیں تو وہ سب بڑے بڑے جاگیردار بن جاتے۔

آخری بات

میں نے یہ دو نظام آپ کے سامنے رکھے ہیں۔ اسلامی ریاست میں یہ نظام علیٰحدہ علیٰحدہ نہیں ہوتے بیک وقت موجود ہوتے ہیں۔ اسلامی نظام کی برکات کا ظہور صرف اس قانونی نظام سے نہیں ہوگا۔ میں واضح کر دوں کہ جب تک معاشرے میں بالفعل ایسے لوگ موجود نہ ہوں جو ایمانی اور روحانی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہوں، یہ مقصد حاصل نہ ہو سکے گا۔ ایک ہمارا معاشرہ ہے جس میں اصل قدر دولت کی ہے۔ جس کے پاس دولت و سرمایہ ہے وہ صاحبِ عزّت ہے۔ اس سے بڑے سے بڑا نیک آدمی بھی جھک کر ملے گا۔ ذرا چشمِ تصور میں لائیے شیخ احمد سرہندی، یا سلطان الہند نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہما کو جو قرآن کی ایمانی تعلیمات کا مظہرِ اتم ہیں۔ ان کو دنیا کی کسی شے سے کوئی رغبت نہیں ہے، وہ دنیا کی کسی شے کی ملکیت حاصل کر کے بھی فخر کرنے والے نہیں۔ دو وقت کی روٹی اور سر چھپانے کو چھت اگر ہے تو کافی ہے۔ اس پر مزید حصول کی ان کے سامنے کوئی اہمیت ہی نہیں۔ ان کی زندگی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ دولت کے انبار اور شاہی سلطنت کا جاہ و جلال ان کو متاثر نہیں کرتا اور وہ عملی نمونہ ہیں "قل العفو" کی قرآنی تعلیم کا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو Inspire کرتے ہیں اور ان سے معاشرے میں اقدار کا تعین ہوتا ہے جن کی موجودگی میں وہ ایمانی حقیقت سامنے رہتی ہے کہ اصل مسئلہ "معاش" کا نہیں، دنیا کی خاطر دوڑ دھوپ کا نہیں، بلکہ "معاد" کا ہے، آخرت کا ہے۔ اصل چیز دولت و ثروت نہیں، نیکی اور عمل صالح ہے۔ اللہ کی محبت، اس کی بندگی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت اور ان کی سُنّت کا اتباع ہے۔ اور اگر روشنی کے یہ مینار بالفعل موجود نہ ہوں تو میں یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ صرف قانونی نظام سے اسلام کی برکات کا ظہور کبھی نہیں ہوگا۔

اس بات کو ناگزیر ضرورت کی حیثیت سے اپنے سامنے رکھیے کہ معاشرے میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی مثال کو زندہ رہنا چاہیے۔ ہمیں اصحاب صفہ کا فقر سامنے رکھنا چاہیے کہ ان کے پاس لنگوٹیاں تھیں تو اتنی کہ سجدے میں جاتے ہوئے ان کو اندیشہ ہوتا کہ کہیں ان کا ستر نہ کھل جائے، پیچھے والے ان کا ننگ نہ دیکھیں۔ منتظر رہتے کہ جب سب لوگ سجدے میں چلے جائیں تو وہ سجدے میں جائیں۔۔۔ پیچھے وہ لگ آگیا ہے تو یہ اسلام کے ساتھ سب سے بڑی دشمنی ہوگی۔

ہر دور کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں، آج وہ تقاضے یکسر بدل چکے ہیں (کسی دور میں استحسان اور مصالح مرسلہ کا کسی ایک طرف رُخ تھا تو آج دوسری طرف رُخ ہے) آج ضرورت ہے کہ اجتہاد کر کے اسلام کا پورا نظام جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اپنی کلیت (Totality) کے ساتھ لوگوں کے سامنے لایا جائے کہ یہ ہے اسلامی نظام۔ اگر نافذ کرنا ہے تو اس کو پورے کا پورا نافذ کرنا ہوگا اور اسی کی ایک حقیر سی کوشش میں نے اس وقت کی ہے۔ ●●●

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ؕ
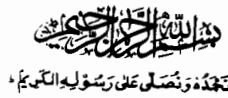
سرمایہ اور محنت

محترم صدرِ مجلس اور معزز خواتین و حضرات! آج میں اس مجلس میں خطاب کرتے ہوئے کچھ دقّت سی محسوس کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ اگرچہ میں قرآن مجید کا ایک ادنیٰ طالب علم اور اسلام کا ایک ادنیٰ خادم ہوں اور اس اعتبار سے مجھے زندگی کے تمام مسائل کے بارے میں قرآن مجید کی راہنمائی پیش کرنے کا اہل ہونا چاہیے۔ تاہم یہ ٹیکنیکل مسئلہ کہ **سرمایہ** اور **محنت** کے درمیان توازن کیسے پیدا کیا جائے واقعتاً دورِ جدید کے مشکل اور پیچیدہ ترین مسائل میں سے ہے۔ بلکہ اس کو اگر تقریباً لاینحل کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اس امر سے کہ مجھے اس میدان میں کبھی کوئی عملی تجربہ نہیں ہُوا۔ چنانچہ ایک طرف میں معروف معنی میں محنت کش بھی نہیں اور دوسری جانب سرمایہ دار تو کیا 'سرمایہ کار' بھی نہیں ہوں، لہٰذا اس کوچے میں میری حیثیت عملی اعتبار سے بالکل نووارد کی سی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محترم بہن صبیحہ شکیل صاحبہ اور محترم سردار صاحب نے میرے لیے مزید دقّت پیدا کر دی یہ فرما کر کہ وہ تو اس اجلاس میں اصلاً میری تقریر سننے کے لیے آئے ہیں۔ بعض دوسرے اصحاب نے بھی اصل راہنمائی کا بوجھ میرے کاندھوں پر ڈال کر میری ذمّہ داری میں اضافہ کر دیا ہے۔ لہٰذا میں پوری کوشش کروں گا کہ اس موضوع پر دین کا جو بھی تھوڑا بہت فہم مجھے حاصل ہے اس کی روشنی میں ان مسائل کا ممکنہ حل آپ کے سامنے رکھوں۔ بیدہ التوفیق وعلیہ التکلان۔

آجر اور اجیر نہیں، آجر اور متاجر

ہمارے ہاں بعض اصطلاحات بہت غلط استعمال ہوتی ہیں۔ آجر اور اجیر میں کوئی فرق نہیں بلکہ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی اُجرت پر کام کرنے والا۔

(یہ مقالہ محکمہ محنت پنجاب کے مضامین سے انتخاب کیا گیا)

اُجرت پر کام کرانے والے کے لیے اصل اصطلاح "متاجر" ہے۔ اسی قبیل کا ایک لفظ "متوفی" ہے جس کے اصل معنی ہیں وفات دینے والا۔ یعنی اللہ، نہ کہ جو فوت ہو رہا ہے جس کے لیے اصل لفظ "متوفا" ہے۔ ایسا ہی ایک لفظ "مغویہ" ہے جس کے معنی ہیں "اغوا کرنے والی"۔ جبکہ اغوا کی جانے والی "مغواۃ" ہے۔ تو متاجر وہ شخص ہے جو کسی سے اُجرت پر کام لے رہا ہو اور آجر ہے وہ شخص جو اُجرت پر کسی کے ہاں کام کر رہا ہو۔

محنت یا عمل

چونکہ مقالے کا اصل موضوع ہے "اسلام میں محنت کا تصور"، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لفظ محنت پر بھی کچھ عرض کر دیا جائے۔ یہ لفظ اگرچہ عربی زبان ہی کا ہے مگر نہ قرآن مجید میں اس معنی میں استعمال ہُوا ہے، نہ حدیثِ نبویؐ میں، نہ ہی موجودہ فصیح عربی میں یہ اس معنی میں مستعمل ہے۔ قرآن و حدیث کی اصل اصطلاح "عامل" ہے۔ یعنی عمل کرنے والا یا محنت کرنے والا۔ پھر دوسرا لفظ وہی آجر یا اجیر استعمال ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں کمائی کا اصل تصوّر

اس موقع پر یہ وضاحت مناسب ہوگی کہ اس مسئلے پر ہمارے لیے قرآن مجید و حدیث میں بہت کم راہنمائی موجود ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید کی رُو سے انسان کی اصل "کمائی" نیکی یا بدی کی ہے، چنانچہ اس میں اصل زور "کسبِ خیر" کی ترغیب اور "کسبِ شر" سے اجتناب پر ہے؛ یعنی قرآن کا اصل Emphasis معاش پر نہیں بلکہ "مَعاد" پر ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سوائے ایک آدھ استثنائی مثال کے "کسب" کا لفظ قرآن مجید میں رزق کے لیے استعمال ہی نہیں ہُوا۔ الغرض از رُوئے قرآن انسان کی اصل کمائی وہ خیر و شر یا بھلائی یا بُرائی ہے جو وہ آخرت کے لیے کما رہا ہے؛ یہ اصل کسب ہے۔ اس کے برعکس رزق کیلیے قرآن مجید کی اصل اصطلاح "فضل" ہے یعنی قرآن جو تصوّر دیتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ اس کی محنت کا حاصل یا صلہ نہیں بلکہ فضلِ خداوندی ہے۔ قرآن کے نزدیک یہ قارونیت ہے کہ انسان اس مغالطے یا زعم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ جو دنیوی سازو سامان یا مال و متاع اسے حاصل ہے وہ اس کا اپنا پیدا کردہ ہے جیسے کہ قارون نے کہا تھا کہ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِیْ یعنی یہ سب کچھ مجھے اپنے علم کی وجہ سے حاصل ہُوا ہے؛ گویا یہ میرے علم و فہم، میری ذہانت و فطانت، میری پیش بینی و پیش بندی، میری پلاننگ

اور فورسائٹ (Foresight) کا نتیجہ ہے۔ قرآن مجید اس کی نفی کرتا ہے اس کی تعلیمات کی رُو سے محنت انسان ضرور کرتا ہے مگر جو کچھ اس کو ملتا ہے وہ سراسر اللہ کا فضل ہے نہ کہ اس کی محنت کا حاصل یا صلہ۔ اسلام کے اخلاقی نظام کے لیے اصل بنیاد یہی تصور فراہم کرتا ہے جبکہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کی اصل بنیاد ہے "قارونیت"۔

محنت کا ذکر حدیث نبوی ﷺ میں

حدیث شریف میں محنت یعنی مزدوری اور عملِ ید یعنی انسان کے خود اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی بڑی عظمت وفضیلت وارد ہوئی ہے۔ مثلاً بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: مابَعَثَ اللہ نبیاً الّا رعی الغنم فقال اصحابہ "وانت"؟ قال "نعم کنت ارعی علیٰ قراریط لاھل مکۃ"۔

یعنی اللہ نے کوئی نبی مبعوث نہیں فرمایا جس نے اُجرت پر بھیڑیں نہ چَرائی ہوں۔ صحابہؓ نے (متحیر ہو کر) سوال کیا: "اللہ کے رسُول صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ نے بھی یہ کام کیا ہے"؟ اس کا جو جواب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ ہم سب کے لیے بہت اہم ہے، اس لیے کہ اس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تواضع و انکسار بھی نمایاں طور پر جھلک رہا ہے:

"میں تو چند قراریط کے عوض (چند ٹکوں کے عوض) مکہ کے لوگوں کے جانور چَرایا کرتا تھا"

معلوم ہوا کہ اجرت یا مزدوری پر دوسروں کے لیے کام کرنا ہرگز باعثِ ندامت یا موجبِ شرم نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگرچہ یہ تو مسلّمات میں سے ہے کہ جو شخص خود اپنے سرمائے سے کام کر رہا ہو خواہ وہ جھاڑی ہی لگاتا ہو اس کے لیے کسی احساسِ کمتری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جبکہ انسان کسی اور کے لیے اُجرت پر کام کرنے میں یقیناً عار محسوس کرتا ہے لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے فرمایا کہ میں خود اجرت پر دُوسروں کیلیے کام کرتا رہا ہوں۔ لہذا یہ قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ یہ ہرگز ایسی بات نہیں ہے جس پر انسان کسی بھی درجے میں ندامت یا شرم محسوس کرے۔

حضرت موسیٰؑ بحیثیت اجیر

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے اُجرت پر کام کرنے کا ثبوت قرآن مجید سے ملتا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام پورا صحرائے سینا پیدل عبور کرکے "مدین"

یعنی مدین کی بستی کے باہر کنویں پر پہنچے تو قرآن مجید نے ان کی اُس وقت کی بے چارگی اور دنیوی اعتبار سے بے وسیلہ ہونے کی کیفیت کا نقشہ کھینچنے کے لیے ان کی دعا کے یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں کہ رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ (القصص) "پروردگار! جو خیر بھی تُو میری جھولی میں ڈال دے میں اس کا محتاج ہوں"۔ یعنی میری حالت اس فقیر و مسکین کی ہے جسے ایک پیسہ بھی دیا جائے تو وہ اسے نہیں ٹھکراتا، بلکہ شکریے کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ تو یہ ہیں وہ الفاظ جو اللہ کے ایک جلیل القدر رسُول حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی زبان سے نکلے۔ وہاں جب اللہ تعالیٰ نے یہ صورت پیدا فرما دی کہ شیخ مدین کی صاحبزادیوں نے ان کی جس جسمانی قوت اور اخلاقی عصمت و عفّت کا بچشم سر مشاہدہ کیا تھا اس کی بنا پر انھوں نے اپنے والد سے سفارش کی کہ یٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ز اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ (القصص) یعنی ابا جان! بہترین شخص جسے آپ اُجرت پر کام کرنے کے لیے رکھیں قوی بھی ہونا چاہیے اور امین بھی، اور دونوں صفات اس شخص میں موجود ہیں۔ اور شیخ مدین نے آگے بڑھ کر اپنی ان دونوں بیٹیوں میں سے ایک کے نکاح کی پیشکش حضرت موسیٰؑ کو کر دی تو آٹھ یا دس برس کی مزدوری ان کا مہر قرار پایا اور حضورؐ کا ارشاد ہے کہ موسیٰ علیہ السّلام نے اپنی عصمت و عفت کی حفاظت اور اپنا پیٹ بھرنے کے لیے آٹھ یا دس سال مسلسل مزدُوری کی۔

"اِنَّ موسیٰ اٰجر نفسہٗ ثمان سنین او عشراً علیٰ عِفّۃ فرجہ و طعامِ بطنہ"۔ رواہ احمد و ابن ماجۃ۔

حضرت داؤدؑ اور عملِ ید

اسی طرح بخاری ہی کی ایک اور حدیث کا حوالہ بھی یہاں بے محل نہ ہوگا: "عَنْ مِقْدَادِ بْنِ مَعْدِیکرب قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا اَکَلَ اَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَیْرًا مِّنْ اَنْ یَّاْکُلَ مِنْ عَمَلِ یَدِہٖ وَکَانَ نَبِیُّ اللّٰہِ دَاوٗدُ یَاْکُلُ مِنْ عَمَلِ یَدِہٖ"۔

(ترجمہ) کسی شخص نے اس سے بہتر روزی نہیں کھائی جس نے اپنے ہاتھ سے کام کرکے روزی کمائی اور اللہ کے نبی داوُد اپنے ہاتھ سے کام کرکے روزی کماتے تھے۔

ناصرالدین محمودؒ اور اورنگزیب عالمگیرؒ

اور یہی بات ہمیں اپنے ماضی قریب کی روایات میں بھی نظر آجاتی ہے۔

ناصرالدین محمودؒ اور اورنگ زیبؒ جیسے بادشاہ اسی برصغیر میں گزرے ہیں جنھوں نے شاہی خزانے سے کوئی استفادہ کرنے کی بجائے خود محنت کر کے اپنی گزر اوقات کا سامان مہیا کیا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ یہ باتیں سطحی نہیں ہیں بلکہ اپنے اندر گہرائی لیے ہوتے ہیں۔ اگر یہ باتیں ہماری فکر و سوچ میں سرایت کر جائیں تو ایک عظیم انقلاب واقع ہو جائے۔

اُجرت کی ادائیگی میں عجلت

اب آئیے اس موضوع پر دینی تعلیمات کے دوسرے جُز کی طرف، یعنی ان ہدایات کی جانب جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محنت کشوں کے حقوق کے سلسلے میں دی ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو ابن ماجہ کی وہ مشہور حدیث آتی ہے جس کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرو ابن العاص (رضی اللہ عنہما) ہیں۔ یعنی" اوتوا الاجیر اجرہٗ قبل ان یجف عرقہٗ "۔

(ترجمہ) "مزدور کو اس کی اجرت ادا کر دو اس سے پہلے کہ اس کا پسینہ خشک ہو"۔

ماتحتوں کے ساتھ حُسنِ سلوک

اور دوسری حد درجہ جامع حدیث وہ ہے جو ماتحتوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کے سلسلہ میں امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے حضرت معمور بن سوید سے روایت کی ہے۔ جس میں اصل واقعہ تو حضرت ابوذر غفاری کا بیان ہُوا ہے لیکن ضمناً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مستقل اور دائمی ہدایات بھی نقل ہو گئی ہیں۔

حضرت معمور ابن سوید بیان فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ کو ان کے ایک غلام کے ساتھ دیکھا کہ دونوں نے بالکل ایک ہی طرح کا حلّہ پہن رکھا تھا اس پر انھوں نے (حضرت معمور نے) پوچھا: "آخر آپ نے ایسا کیوں کیا؟" تو اس پر حضرت ابوذرؓ نے فرمایا کہ میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ ایک شخص نے اپنے غلام کو گالی دی اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت سرزنش فرمائی اور ارشاد فرمایا: "ھم اخوانکم جعل اللہ تحت ایدیکم" یعنی یہ تمھارے ہی بھائی ہیں، انسان ہیں، آدم اور حوّا کی نسل سے ہیں۔ اللہ نے انھیں تمھارے ماتحت کر دیا ہے۔

اس کے بعد آپؐ حکم دیتے ہیں: "فمن کان اخوہ تحت یدہٖ فَلْیُطْعِمْہُ مِمَّا

یاکل وَلیُلبِسۀ ممایلبس ولاتکلفوھم ما یغلبھم فان کلفتموھم فاعینوھم "جس شخص کے ماتحت اللہ نے کسی اور شخص کو کر دیا ہو تو اسے چاہیے کہ جو کھانا وہ خود کھاتا ہے اسے بھی کھلائے، جو خود پہنتا ہے اسے بھی پہنائے۔ ان پر اتنا بار نہ ڈالو جس سے وہ دب کر رہ جائیں اور اگر ایسی مشقت ڈالنی لازم ہی ہو جائے تو خود بھی شریک ہو جاؤ اور ان کی مدد کرو۔"

سوال کی مذمّت اور محنت مزدوری کی ترغیب

یہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح سوال کرنے کی بجائے محنت مزدوری کرکے پیٹ پالنے کی ترغیب دلائی ہے وہ بھی پیش نظر رہے: لان یاخذ احدکم احبلہٗ ثم یاتی الجبل فیاتی بحزمۃٍ من حطبٍ علیٰ ظھرہ فیبیعھا فیکف بھا وجھہ خیرلّہٗ من ان یسئال اعطوہ او منعوہ" (بخاری عن زبیر بن العوامؓ)

"تم میں سے کسی شخص کا رسی لے کر پہاڑ پر چلا جانا اور پھر لکڑیوں کا گٹھہ پیٹھ پر لاد کر بیچنا اور اس طرح اپنے چہرے کو (یعنی عزتِ نفس) بچانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے سوال کرے اور وہ چاہے تو اس کو کچھ دے دیں اور چاہے تو خالی ہاتھ لوٹا دیں۔"

تو یہ ہیں وہ اصول جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماتحتوں کے بارے میں وضع فرمائے ہیں اور یہی ہیں وہ اخلاقی تعلیمات کہ جب تک وہ کسی معاشرے میں بالفعل موجود نہ ہوں تو محض کوئی خشک قانونی ڈھانچہ، خواہ اس کی کتنی ہی پیروی کیوں نہ کر لی جائے، معاشرے میں وہ برکات پیدا نہیں کر سکتا جو اسلام کی منشا ہیں اور جن کی ہم توقع رکھتے ہیں۔

اب میں اصل مسئلے کی طرف آتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے کیونکہ ایک تو اس کا تعلق نظام اقتصادی کے ساتھ ہے اور دوسرے یہ کہ یہ کوئی الگ تھلگ مسئلہ نہیں ہے بلکہ انسانی اجتماعیات کے تمام پہلو یعنی سماجی، سیاسی اور معاشی مل کر ایک ناقابلِ تقسیم وحدت بنتے ہیں، ان میں سے کسی ایک کو علیحدہ کرکے اس پر غور نہیں کیا جا سکتا۔ ایک فلسفہ زندگی اور نظریۂ حیات کی بنیاد پر جو نظامِ حیات وجود میں آئے گا اس کا اپنا ایک سماجی نظریہ ہوگا اور اسی کے ساتھ مناسبت رکھنے والا ایک معاشی

نظام وجود میں آئے گا اور اسی نوعیت کا سیاسی ڈھانچہ بھی ترتیب پائے گا اور سب مل کر ایک Organic whole بن جائیں گے' لہذا ان میں سے کسی ایک جزو کو نکال کر اس کی کسی اور نظام کے ساتھ پیوندکاری ناممکن العمل فعل ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں جو اصطلاحات مستعمل ہیں مثلاً اسلامی جمہوریت اور اسلامی سوشلزم' ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاید اسلام کے ایمانیات، عبادات اور اخلاقیات لے کر دوسرے نظام ہائے زندگی کی عملی تشکیل کے مابین پیوندکاری کر سکتے ہیں۔ میرے نزدیک یہی اصل مغالطہ ہے۔ اسلام کی بنیاد اپنے ایک نظریے پر ہے جسے ہم ایمان کہتے ہیں۔ اس جڑ پر اگر تنا کھڑا ہوگا تو اس سے نکلنے والی تمام شاخیں باہم مربوط ہوں گی لیکن اگر وہ جڑ کمزور ہو یا اس جڑ کا بحیثیتِ جڑ سرے سے وجود ہی نہ ہو تو کسی بھی مصنوعی طریقے سے پیوندکاری کرکے اسلام کی برکات حاصل نہیں کی جا سکتیں۔

ایمان کیا ہے

خدا اور اس کے رسولؐ پر اس یقین کے ساتھ ایمان کہ جو کچھ اللہ نے فرمایا اور جو راہ اس کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھائی اس پر چلے بغیر اس زندگی اور آخرت کی زندگی میں کامیابی نہیں اور اس بات کا یقین کہ آخرت میں ہمارے عمل کا نیکی اور برائی کی صورت میں بدلہ ملے گا یہ یقین ہی ایمان کی وہ بنیاد فراہم کرتا ہے کہ ہماری یہ دنیوی زندگی ہی حرفِ آخر نہیں بلکہ اصل زندگی تو موت کے بعد کی ہے اور انسان کا اصل مسئلہ بعد الموت زندگی سے متعلق ہے۔ رہی اس دنیا کی ناپائیدار زندگی' تو یہ فانی ہے' عارضی ہے' اس کی کوئی حیثیت نہیں' اور اگر کچھ ہے بھی تو نہ ہونے کے برابر۔ ایمان کی یہ دو بنیادیں قرآن مجید کی اس ایک آیت میں سموئی ہوئی ہیں: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ (اللہ ہی ہمارا مبدأ و معاد ہے' ہم اس کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف جانے والے ہیں) گویا یہ ایک سفر ہے۔ جب فی الواقع ایمان کی یہ دو بنیادیں قائم ہو جائیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ "کن فی الدنیا کانک غریبٌ او عابر سبیل" (الحدیث) کے مصداق ایک "اجنبی" یا "راہ چلتے مسافر" کی طرح زندگی بسر کرنے کا سلیقہ آ جاتا ہے۔ راہ چلتے مسافر کو اس راہگزر سے جس قدر دلچسپی ہوتی ہے مومن کو بھی اس دنیا سے اتنی ہی دلچسپی ہوتی ہے۔

اسلامی نظام کا وجود

اس وقت دنیا میں بالفعل تو دو ہی نظام ہائے معیشت موجود ہیں یعنی سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت، رہا اسلام کا نظامِ معیشت، تو وہ دنیا کی ایک اِنچ زمین پر بھی بالفعل قائم نہیں ہے اس کا وجود تو صرف ہمارے ذہنوں میں ہے یا ہماری زبانوں کی نوک پر یا اسی قبیل کی چیز ہے قلم جس تک یہ تصوّر محدود ہے۔

اسلام بمقابلہ اشتراکیت و سرمایہ داریت

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ اگرچہ اشتراکیت (Communism) اور سرمایہ داریت (Capitalism) دونوں بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں، ایک مشرق ہے تو دوسرا مغرب، لیکن اسلام کے مقابلے میں ان دونوں میں ایک قدر مشترک ہے۔ یہ آپس میں تو متضاد اور مقابل ہیں لیکن اسلام کے مقابلے میں اپنے فکری پس منظر کے ساتھ ایک ہی تنے کی دو شاخیں ہیں۔ اسلام جہاں مادّیت کے مقابلے میں رُوحانیت اور اس دنیوی زندگی کے مقابلے میں آخرت کی دعوت دیتا ہے یہ دونوں نظام صرف اور صرف مادہ پرستی کی بنیاد پر قائم ہیں ـــــ یہ فلسفہ مادّیت ہی تھا جس نے ایک قدم آگے بڑھا کر جدلی مادّیت (Dialectical materialism) کی شکل اختیار کرلی اور Communism وجود میں آیا۔

اسلام کا معاملہ ان دونوں سے مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنی ہی قائم کردہ بنیادوں پر اپنے مکمل ڈھانچے میں قائم ہو سکتا ہے اور کسی قسم کی پیوندکاری قبول نہیں کرتا۔ لہٰذا جب تک وہ نظریاتی بنیاد استوار نہ ہو اسلامی نظام کے ڈھانچے کا خیال گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنے کے مترادف ہوگا۔ پہلے نظریاتی بنیاد کا استحکام ضروری ہے اس لیے کہ اسلام تو "ایمان" ہی کی بنیاد پر قائم ہوگا۔ اس کے علاوہ کسی اور جڑ یا بنیاد پر اس کے قیام کا تصوّر ہی بے کار ہے۔

اسلام میں عدل وقسط کی اہمیت

اسلام کی متذکرہ بالا اساس یعنی ایمان کو استوار کرنے کے ساتھ ساتھ اِس بات سے انکار بھی ممکن نہیں ہے کہ اسلام نے عدل و قسط کے قیام کو بھی بنیادی اہمیت دی ہے۔ شریعت ، انزالِ کُتب اور بعثتِ رُسل کا مقصد نیز دین کا پُورا ڈھانچہ

ان سب کا مرکزی خیال قیامِ عدل وقسط ہے یعنی عدل وانصاف پر مبنی ایک نظامِ حیات کا قیام گویا اسلام و ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔

چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت "قَآئِمًا بِالْقِسْطِ" (انصاف کا قائم کرنے والا) بھی آئی ہے۔ اس کے علاوہ ارشادِ خداوندی ہے :

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ (النساء)	اے ایمان والو! عدل اور قسط کے قائم کرنے والے اور اللہ کے گواہ بنو۔
يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ۔ (المائدہ)	اے اہلِ ایمان! اللہ کی خاطر راستی پر قائم ہونے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔

یہ ایک ہی بات کو دو پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے لیکن اس خوب صورت انداز میں کہ روح وجد کرنے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ فرمایا :

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ (الحدید)	ہم نے بھیجے اپنے رسول تبینات دے کر اور ہم نے اتاری ان کے ساتھ کتاب اور میزان تاکہ لوگ عدل وانصاف پر قائم رہیں۔
وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَّ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ (الشوریٰ)	اور کہو! میں ایمان رکھتا ہوں اس پر جو اللہ نے مجھ پر اُتارا اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمھارے مابین عدل کروں۔

چنانچہ فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ سے جب ایرانیوں نے پوچھا کہ آپ ہم پر کیوں حملہ آور ہوئے تو آپ نے جواباً فرمایا :

انا قد ارسلنا لنخرج الناس من ظلمات الجهالة الى نور الايمان ومن جور الملوك الى عدل الاسلام۔	ہمیں بھیجا گیا ہے کہ ہم لوگوں کو جہالت کے اندھیروں سے نورِ ایمان کی طرف نکالیں اور شہنشاہی استبداد سے نجات دلا کر عدلِ اسلام سے روشناس کرائیں۔

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیعتِ خلافت کے بعد جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ اسلامی مملکت کے اصول متعین کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا: "تم میں سے ہر قوی میرے نزدیک ضعیف ہے جب تک اس سے حق وصول نہ کرلوں اور تم میں سے ہر

ضعیف میرے نزدیک قوی ہے جب تک اس کا حق نہ دلوا دوں"۔ گویا نظامِ عدل و قسط کا قیام، اسلامی ریاست کا بنیادی مقصد ہے۔

امتیازی سلوگن

ہر نظام میں کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے مفہوم کے اعتبار سے اس نظام کا امتیازی سلوگن (Slogan) بن جاتے ہیں۔ Capitalism میں آزادی (Freedom) کی تکرار ملے گی۔ یہ گویا ان کے فکر کی بنیاد اور مرکز و محور ہے۔ اس طرح اشتراکیت (Socialism) میں مساوات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں نوعِ انسانی کے لیے کشش ہے، اس مرحلے پر یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ دونوں اعلیٰ قدریں ہیں۔ آزادی بھی ایک اعلیٰ قدر ہے اور مساوات بھی۔ ان کے مقابلے میں اسلام نے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے "عدل" کا تصور دیا ہے، وہ آزادی اور مساوات کے درمیان بھی عدل کا راستہ تجویز کرتا ہے۔ نہ تو آزادی اس قدر بڑھ جائے کہ مساوات کو ہڑپ کر جائے اور نہ مساوات کا ہوّا کھڑا ہو کر آزادی جیسی اعلیٰ اقدار سے انسانی معاشرہ کو محروم کر دے۔ "آزادی کی قیمت پر مساوات اور مساوات کی قیمت پر آزادی" اسلام ان دونوں کے حق میں نہیں ہے۔ اسلام عدل چاہتا ہے اور یہی وہ لفظ ہے جس کو اسلام کا امتیازی Slogan قرار دیا گیا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ دُنیا میں نظامِ عدل کے قیام کی غرض آخر کیا ہے؟ اس طرف انسانی اجتماعیات کے بہت بڑے عالم حضرت شاہ ولی اللہؒ نے توجہ دلائی ہے وہ فرماتے ہیں:

> "قرآن حکیم کی واضح تعلیمات کے مطابق مسلم معاشرے کو حکم دیا گیا ہے کہ نہ اسراف کیا جائے نہ تبذیر، بلکہ راہِ اعتدال اختیار کی جائے۔ اسراف کا مطلب ہے حد سے زیادہ خرچ کرنا اور تبذیر سے مراد ہے بے جا اور فضول خرچ کرنا۔

① وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (الاعراف)	اور کھاؤ پیو لیکن اسراف نہ کرو بے شک وہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔
② وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ (بنی اسرائیل)	اور بے جا خرچ نہ کرو، بیشک بے جا خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔
③ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ	اور اپنے ہاتھ کو اپنی گردن کے ساتھ باندھ کر

وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۔ (بنی اسرائیل)

نہ رکھ اور نہ اسے بالکل ہی کھول دے ورنہ تو بیٹھ رہے گا الزام کھایا ہارا ہُوا۔

(۴) وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا۔ (سورۃ الفرقان)

اور (رحمٰن کے بندے) وہ لوگ ہیں جو خرچ کرتے ہیں تو فضول نہیں کرتے اور نہ تنگی کرتے ہیں، بلکہ (ان کا خرچ) ان دونوں کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔

معاشرے کے تین معروف معیارات

عموماً معاشرے میں تین قسم کے معیارِ زندگی پائے جاتے ہیں:

ا : رفاہیت بالغہ یعنی عیاشانہ معیار زندگی جس میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی چیز پسند کی جاتی ہے، اس طرح حد سے زیادہ بلکہ بے جا خرچ کیا جاتا ہے اور دولت کو ضائع کیا جاتا ہے۔

ب : رفاہیتِ ناقصہ یعنی پست معیارِ زندگی۔ جس میں زندگی کی ضروریات بھی پوری طرح حاصل نہیں ہوتیں اور جانوروں کی سی زندگی بسر کی جاتی ہے۔

ج : رفاہیتِ متوسطہ۔ یعنی درمیانہ معیار زندگی جس میں زندگی کی ضروریات متوسط درجے میں حاصل ہوتی ہیں اور انسان اتنی فراغت پاتا ہے کہ وہ اپنی اور دوسروں کی بھلائی کے لیے بھی کوئی کام کر سکے اور خدا کو بھی یاد کر سکے۔

اللہ تعالیٰ نے رفاہیتِ بالغہ یعنی عیاشی کو ناپسند فرمایا ہے۔ اور ایسی معاشرت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے جس سے انسان دنیا کی طلب کے اندر ہی الجھ کر رہ جائے اور معیشت کی باریکیوں میں اُتر جائے اور اس کے اندر انتہائی تعمق اور غلو کرنے لگے۔ چنانچہ ریشم، سونے چاندی کے برتن اور بھاری زیورات مثلاً کنگن، گلوبند، ہار، طوق، پازیب وغیرہ کا استعمال اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہیں کیونکہ یہ چیزیں انسان کو اسفل السافلین میں پہنچا دیتی ہیں اور انسانی افکار کو مختلف قسم کی باریکیوں میں الجھا دیتی ہیں۔ رفاہیت کی اصل حقیقت یہ ہے کہ معاشرتی زندگی میں اچھی چیزیں طلب کی جائیں اور ادنیٰ سے اعراض کیا جائے۔ لیکن رفاہیتِ بالغہ یہ ہے کہ ایک ہی چیز میں سے سب سے اعلےٰ کا انتخاب کیا جائے۔"

"رفاہیت ناقصہ عموماً ان لوگوں کا معیار زندگی ہوتا ہے جو آبادیوں سے دُور پہاڑی

علاقوں میں بسنے [illegible]
اکثریت صرف دال روٹی کے حصول میں سرگرداں ہو۔ معاملہ جب یہ ہو جاتے کہ
انسان بنیادی ضروریات کی فراہمی کے لیے کمر توڑ دینے والی محنت کرے اور پھر بھی
اس کی ضروریات پوری نہ ہوں تو انسان کا حیوانی سطح پر آجانا کوئی بعید از قیاس بات
نہیں۔ اس لیے اسلام نظامِ عدل و قسط قائم کرنا چاہتا ہے نہ صرف قانونی نظام بلکہ
سماجی عدل بھی۔ تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ اللہ کی معرفت حاصل کریں، اس سے لو
لگائیں، اس سے محبت کریں اور اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا کریں اور یہ صرف اس صورت
میں ممکن ہے کہ انھیں اس کے لیے فرصت ہو، وقت ملے اور یہ نہ کہہ سکیں۔

ع تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

اسلام کے معاشی نظام کے دو رُخ

اسلام کس قسم کا معاشی اور اقتصادی نظام قائم کرنا چاہتا ہے ؟ اس کی وضاحت سے قبل اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ اسلام کے معاشی

ـــ حجۃ اللہ البالغہ

نظام کے دو رُخ یا پہلو ہیں یا یوں سمجھیے کہ دو حصے ہیں مگر اس طرح کہ دونوں اپنی اپنی جگہ ایک مکمل نظام کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ دونوں کا اپنا ایک فلسفہ ہے، اپنا نظریۂ ملکیت اور نظریۂ حقوق ہے اور اسی طرح دونوں کا اپنا نظریۂ قدرِ زائد ہے۔ معاشی نظام میں اہمیت رکھنے والی تمام چیزیں ان دونوں نظاموں میں جُدا جدا ہیں اور اپنا جداگانہ فلسفہ رکھتی ہیں۔ سورۃ الرحمٰن کی آیۂ مبارکہ

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۔ — دو روئیں جو برابر چل رہی ہیں مگر ان کے درمیان ایک غیر مرئی پردہ حائل ہے جو انھیں باہم مدغم نہیں ہونے دیتا۔

کے مصداق اسی شکل میں یہ دونوں نظام موجود ہیں اور اسلام جو مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے وہ ان دونوں کے حسین امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔

خلط مبحث

ہمارے ہاں خلط مبحث ہوتا ہے اور ہر شخص اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اسلام کے معاشی نظام کی تشریح و تعبیر کرتا ہے۔

جو لوگ سوشلزم اور کمیونزم سے متاثر ہیں وہ انفرادی ملکیت کی کامل نفی کرتے ہیں۔ ضرورت سے زاید ہر چیز چھین لینے کی بات کرتے ہیں اور دوسرا پہلو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں، مثلاً قانونِ وراثت بھی تو قرآن مجید میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ نظام میں بھی جبری مساوات کی نفی کر دی گئی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ جائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت پر تصرّف بلکہ وراثتاً جائیداد کی منتقلی کا حق بھی تسلیم کیا گیا ہے۔

دوسری طرف وہ لوگ جو کمیونزم سے خار کھاتے ہیں تو اسلام کے قانونی نظام کا دم بھرتے ہیں جبکہ اس کے رُوحانی نظام کو نظر انداز کرتے ہیں۔ انفرادی ملکیت کو اس قدر نمایاں کرتے ہیں کہ ایک استحصالی سرمایہ دارانہ نظام کا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

حضرت ابوذر غفاری ﷛ کا طرزِ عمل

یہ دونوں قسم کے نقطہ ہائے نظر کسی غلط فہمی کی بنیاد پر بھی پیدا ہو سکتے ہیں اور خلوصِ نیت کے ساتھ بھی۔ اسلام کے قرنِ اول میں بھی یہ غلط فہمی پیدا ہوئی،

چنانچہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے جن پر زہد اور فقر کا غلبہ تھا" آیۂ کنز"[1] کو ظاہری معنوں پر محمول کیا اور اس رائے کا اظہار کیا کہ سونا چاندی اور سرمایہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنے پاس رکھنا حرام ہے۔ اس سے ایک بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ خلافتِ راشدہ نے ان کی اس رائے کو انتہا پسندانہ قرار دیا۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دَور میں انھیں مدینہ بدر کیا گیا اور مدینہ سے باہر ہی ان کا انتقال ہوا۔ ان کے زہد کی شدّت کا یہ عالم تھا کہ جب انتقال ہو رہا تھا تو صرف ان کی اہلیہ محترمہ ان کے پاس تھیں۔ گھر میں ضرورت کی چند چیزیں تھیں مگر ان کے احساسات یہ تھے کہ ان کی موجودگی پر بھی پریشان تھے اور بار بار کہتے تھے "حضورؐ نے فرمایا تھا کہ تم اپنے گرد سانپ اور بچھو جمع کر لوگے اور یہ مجھے نظر آ رہے ہیں" اہلیہ محترمہ نے کہا" کہاں ہیں وہ سانپ اور بچھّو جو ہم نے جمع کر لیے ہیں" تو فرمانے لگے" وہ دیکھو توا ہے، استعمال کے کپڑے ہیں اور یہ سب بچھّو ہی ہیں"

یہ صحیح ہے کہ اسلام قانونی نظام سے رُوحانی نظام کی طرف قدم بڑھانے کا تقاضا کرتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ انسان اس کی طرف پیش قدمی کرے اور اسی بات سے مغالطہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو کامل خلوص کے ساتھ لاحق ہُوا، لیکن بدنیتی کے ساتھ بھی یہ غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اخلاقی و رُوحانی نظام کے اصُول

اسلام کے اخلاقی یا روحانی نظام کے چار اصول ہیں۔

1. ملکیت کی کُلّی نفی۔
2. انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ اس کا کسب نہیں بلکہ اللہ کا فضل ہے، اس کی عطا ہے۔
3. انسان کا حق اس کی جائز ضروریات ہیں۔ بعض احادیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں متعین فرما دیا ہے یعنی دو وقت کے کھانے کے لیے سامان، سر چھپانے کو چھت، دو جوڑے کپڑے اور عفّت و عصمت کی حفاظت کے لیے بیوی۔
4. اب جو کچھ انسان کے پاس بچ رہے اسے دوسروں کی ضروریات کے لیے وقف کر دے، گو کہ قانونی طور پر اسے اس پر حقِ تصرّف حاصل ہے لیکن اخلاقی تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسروں کی طرف منتقل ہو۔

---

[1] الذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذابٍ الیم۔ (التوبہ)

تو یہ اپنے طور پر ایک مکمل نظام ہے۔اس میں نظریۂ ملکیت بھی ہے اور اپنے حق کا تصرف بھی۔ نیز اگر قدر زائد ہے تو اس کا مصرف بھی موجود ہے۔

اخلاقی نظام میں ربوٰ

قرآن مجید میں ربوٰ کا لفظ دو چیزوں کے ضد کے طور پر آیا ہے۔

۱۔ ربوٰ بمقابلہ بیع وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (البقرہ)

۲۔ ربوٰ بمقابلہ صدقات اور تزکیۂ نفس کے واسطے خرچ کرنے کے: جیسے "وَمَا اٰتَیْتُمْ مِنْ زَکٰوۃٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُضْعِفُوْنَ" (الروم)

اسلام کی رُوحانی تعلیمات میں اسی مفہوم کے ساتھ سورۃ البقرہ کی اس آیت میں کہ یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰو وَیُرْبِی الصَّدَقَاتِ (اللہ ربوٰ کو گھٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے)۔

صدقات کے مقابلے میں ربوٰ کا لفظ آیا ہے۔ یوں سمجھیے کہ ایک انسان یا مثلاً ملازم پیشہ آدمی کی ضرورت پوری ہونے کے بعد کچھ سرمایہ اس کے پاس جمع ہو گیا ہے۔ اب اس فاضل سرمائے کے دو مصرف ہیں، یا تو وہ اسے کسی کاروبار میں لگائے۔ اس صورت میں اس کی محنت اس میں شامل نہیں ہو گی۔ اب اس اخلاقی نظام میں فاضل سرمائے سے جو بڑھوتری ہو گی وہ بھی ربوٰ قرار پائے گی۔ اس کا صحیح مصرف یہ ہے کہ اسے محتاجوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیا جائے وہ لوگ جن کے پاس کاروبار کی بُنیاد ڈالنے کے لیے سرمایہ موجود نہیں انھیں سرمایہ فراہم کیا جائے تاکہ وہ رزقِ حلال باعزّت طریقے سے حاصل کرنے کے قابل ہو سکیں۔ ان کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ان کی محنت میں سے حصہ وصول کرنا گو قانونی طور پر جائز بھی ہو، اخلاقی اور رُوحانی سطح پر یہ ممنوعات کی فہرست میں شامل ہو گا۔ اس لیے اس فاضل سرمائے کا مصرف یہ ہونا چاہیے کہ ضرورت مند اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اور اگر زیادہ نہیں تو انھیں یہ سرمایہ بطورِ قرضِ حسنہ ہی دیا جائے تاکہ وہ بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں اور معاشرے میں صاحبِ عزّت اور صاحبِ حیثیت بن سکیں۔ قرآن کی اخلاقی اور روحانی تعلیم کا یہی وہ نکتہ ہے جسے اپنا کر ایک جنتی معاشرہ تشکیل دیا جا سکتا ہے۔

عفو اور قصاص

اسلام کے اخلاقی اور رُوحانی نظام کا فرق و تفاوت بلکہ بعض اوقات تضاد صرف معاشی تعلیمات ہی میں نہیں بلکہ دوسرے قوانین میں بھی ہے مثلاً مظلوم بدلہ لینے کا قانونی حق رکھنے کے باوجود معاف کر

سکتا ہے اور اخلاق اور رُوحانیت کا تقاضا عفو و درگزر ہی ہے[1]۔ جبکہ قانون قصاص لینے ہی میں خیر محسوس کرتا ہے اور اسی کی ترغیب دلاتا ہے[2]۔

قانونی اور فقہی نظام

اس کے بعد آیئے اسلام کی قانونی معاشی تعلیمات کی طرف اور ان کے ضمن میں سمجھئے اسلام میں محنت کے تصوّر کو۔ اسلام کا قانونی معاشی نظام ایک طرح کا Controlled capitalism ہے کہ اس میں تینوں جبلی تقاضے موجود ہیں۔ اس میں نجی ملکیت (Private ownership) بھی ہے اور ذاتی دلچسپی بھی، اور ساتھ ہی ساتھ آزاد معیشت کا تصوّر بھی۔ البتہ اس میں حلال اور حرام کی تفریق موجود ہے۔ پابندی کمانے پر نہیں بلکہ حلال سے تجاوز کرنے پر ہے ملکی قانون حقِ تصرف تسلیم کرتا ہے اور اپنی مرضی سے اللہ کی راہ میں دینے کا تقاضا بھی کرتا ہے۔ البتہ جو فرض ہے مثلاً زکوٰۃ وہ جبراً وصول کر لی جائے گی۔ لیکن زکوٰۃ کے علاوہ اس پر کوئی قانونی پابندی نہیں ہوگی۔ مگر ذہن میں رہے کہ اسلام نے اس قانونی نظام کو دو پہلوؤں سے حدود کا پابند کیا ہے تاکہ یہ ایک لعنت بن کر نوعِ انسانی پر مسلط نہ ہو جائے۔ ایک تو وہ خطوط متعین کیے گئے جن کی موجودگی میں سرمایہ کاری سرمایہ داری بننے سے محفوظ رہے۔ دوسری طرف آزاد معیشت میں بعض لوگوں کے آگے بڑھ جانے اور بعض لوگوں کے پیچھے رہ جانے کے امکان کو تسلیم کر کے جبری مساوات کی بجائے اس فرق و تفاوت کو بڑی حد تک ختم کرنے اور اس درمیانی خلا کو پُر کرنے کے لیے راستہ تجویز کیا گیا۔ نظام زکوٰۃ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اسلام نے ایک حدِ فاصل قائم کر دی ہے کہ جو بھی اس حد سے آگے بڑھ جائیں وہ مال دار ہیں اور دینے کے مکلّف ہیں اور جو اس حد تک نہیں پہنچ سکے وہ مستحق اور ضرورت مند ہیں۔ معروف معنوں میں پہلے والوں کو Haves اور دوسروں کو Have-nots شمار کر لیجیے۔ لیکن یہ تقسیم آپ کے اختیارات کے تابع نہیں کہ آپ جسے چاہیں Have اور جسے چاہیں Have-nots بنا دیں۔ بلکہ نصاب کی ایک حد مقرر کر دی گئی ہے کہ اتنے اونٹ یا اتنا سونا وغیرہ ہے تو دینے والوں کی صف میں اور اگر اس سے کم ہے تو لینے والوں کی صف میں۔ اس تقسیم کے بعد یہ

[1] وَإِنْ تَعْفُوْا وَتَصفحُوا وَتغفِرُوْا فَإِنَّ اللّٰه غَفُوْرٌ رحِيْمٌ ٥ (التغابن)

[2] وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ (البقرہ)

اصول قائم کر دیا گیا:

تؤخذ من اغنیاءھم وترد الی فقراءھم یعنی اغنیاء سے لے کر مستحقین میں تقسیم کی جائے گی تاکہ اس تفریق کا کسی حد تک خاتمہ کیا جا سکے جو معاشرے میں پیدا ہو کر بہت سی برائیوں کا باعث بنے گی۔

ارتکازِ دولت

لیکن ایسا نہیں ہوگا کہ کچھ لوگ تو ارتکاز دولت کر کے عیش و عشرت کی زندگی بسر کریں اور کچھ لوگ ضروریاتِ زندگی سے بھی محروم رہ جائیں۔ اسلام اجتماع و ارتکازِ دولت کا مخالف ہے، سرمائے کو گردش میں لانے کا متقاضی ہے لیکن وہ سرمائے کی فطری گردش کے حق میں ہے۔ سرمائے کی مصنوعی گردش جو سرمایہ دارانہ نظام کا خاصّہ ہے۔ اسلام کے نزدیک پسندیدہ نہیں۔ اس نے اصولاً یہ بات طے کر دی کہ:

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ ۔ (الحشر) تاکہ دولت تم میں سے سرمایہ داروں کے مابین ہی اُلٹ پھیر میں نہ رہ جائے۔

جیسے ایک کروڑپتی کی بیٹی ایک دوسرے کروڑپتی کے بیٹے سے بیاہی گئی۔ لاکھوں کا جہیز اس گھر میں جمع ہو گیا جہاں کروڑوں روپے پہلے سے موجود ہیں۔ سرمایہ تو گردش میں آیا مگر مصنوعی انداز میں۔ اور معاشرے کو اس سے قطعاً کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور یہ سرمایہ نچلے طبقات تک منتقل نہیں ہو سکا۔ اسی طرح ایک سرمایہ دار کے بیٹے کی سالگرہ پر لاکھوں روپے کے تحائف جمع ہو گئے۔ سرمایہ کی گردش کا عمل یہاں بھی وقوع پذیر ہُوا لیکن بَیْنَ الْاَغْنِیَاء (سرمایہ داروں کے درمیان) اسلام کی منشاء یہ ہے کہ معاشرے میں جو بھی ذرائع پیداوار ہیں (اور زمین سب سے بڑا ذریعہ پیداوار ہے) ان کی منصفانہ تقسیم ہو اور ان کا حاصل پورے معاشرے میں پھیلے۔ 'Controlled capitalism' کی جو اصطلاح میں نے استعمال کی ہے اب اسے 'Internally managed capitalism' کے الفاظ میں ادا کیا جا رہا ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام بھی یہ بات جان چکا ہے کہ ننگی اور عریاں سرمایہ داریت اس دَور میں نہیں چل سکتی۔ اس کا کوئی مستقبل نہیں بلکہ وہ تو تباہی کی طرف لے جا رہی ہے۔

بقول علّامہ اقبال ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِکم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

کفالتِ عامہ

سرمایہ دارانہ نظام کلی طور پر اپنے فلسفے کے ساتھ اب قابلِ قبول نہیں رہا۔ اس کا کوئی مستقبل نہیں اور وہ تباہی کے کنارے تک پہنچ چکا ہے۔ اس لیے اپنے تحفظ کے لیے قابلِ عمل اقدامات کر رہا ہے، جس کی نمایاں مثال برطانوی معاشرہ میں ملتی ہے۔ وہاں ان لوگوں کے لیے جو کام نہیں کر پاتے روزگار نہ ہونے کی صورت میں الاؤنس مقرر کر دیے گئے ہیں۔ اس طرح بنیادی ضروریات کی کفالت ریاست اپنے ذمّے لے لیتی ہے، آزاد معیشت کا تصور بھی مجروح نہیں ہوتا اور ضرورت مند لوگوں کی کفالت کا سامان بھی کر دیا جاتا ہے، لیکن غور کیا جائے تو اسلام کے نظامِ معیشت میں یہ اصول چودہ سو سال پہلے طے کیا جا چکا ہے جہاں سرمایہ دارانہ نظام یا بےخدا معاشرہ ٹھوکریں کھا کر اب پہنچ رہا ہے۔ اسلام چودہ سو سال پہلے بتا چکا ہے کہ کمانے کھانے کی آزادی ہے اور آگے بڑھنے کی بھی لیکن جو پیچھے رہ جائیں ان کی بنیادی ضروریات کی فراہمی معاشرہ کا فرض ہے اور زکوٰۃ و عشر کا نظام اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

کفالت عامہ کے اصول کو Collective insurance بھی کہا جا سکتا ہے اس فرق کے ساتھ کہ انشورنس خواہ کسی قسم کی ہو اسے انسان اپنی کمائی میں بچت کر کے حاصل کرتا ہے لیکن اسلام نے جو اصول وضع کیا ہے اس میں ایک طبقہ بچاتا ہے اور جمع کرتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ اس کا فائدہ بھی اُسے ہی پہنچے جس نے بچایا اور جمع کیا ہے بلکہ ایک مال دار اور غنی ہے جو بچاتا اور جمع کرتا ہے۔ اور دوسرا طبقہ جو ضرورتمند ہے اس سے اپنی ضرورت پوری کرتا ہے اور اس کی یہ کفالت نظامِ زکوٰۃ اور عشر کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ اب آئیے اس کے فقہی اور قانونی نظام میں کمائی میں حلال و حرام کی قیود کی طرف۔

حلال وحرام کی حدود

اسلام پہلی شرطِ حلال وحرام کی پاسداری کی عاید کرتا ہے تاکہ معاشرے میں یہ تمیز اٹھ جانے کے بعد جو طوفانِ بدتمیزی برپا ہوتا ہے اور انسانیت کی حیوانیت میں تبدیلی کا عمل شروع ہوتا ہے اس کا سدِ باب کیا جا سکے۔ اس کے بعد ان اقدامات پر نظر ڈالیے جو قرآن مجید اپنے معاشی نظام میں وضع کرتا ہے اور عش عش کیجیے۔ لیکن یہ وضاحت بہرحال ضروری ہے کہ قرآن مجید معاشیات کی کتاب نہیں ہے کہ اس نے عنوانات قائم کر کے معاشی اصطلاحات پر بحث کی ہو اور ایک ایک نکتے کی وضاحت ضروری سمجھی گئی ہو۔ لیکن کتابِ ہدایت ہونے کی بنا پر قرآن مجید میں زندگی کے اس پہلو میں بھی رہنمائی کی گئی ہے۔ قرآن مجید نے جو ہدایات دی ہیں ان سب کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ اسلام اپنے قانونی نظام میں بھی زیادہ سے زیادہ محنت پر انحصار کرتا اور سرمایہ کو کم از کم اہمیت دیتا ہے۔ محنت اور سرمائے کے امتزاج سے معاشی ڈھانچہ کی تشکیل کو وہ تسلیم کرتا ہے لیکن محض سرمائے کی بنیاد پر بغیر محنت کے کمائی کو وہ اچھا نہیں سمجھتا۔ اس کے نزدیک اصل چیز محنت ہے سرمایہ نہیں مثلاً اس کی بدترین صورت یہ ہے کہ کسی کاروبار میں سرمایہ لگانے والا شخص منافع میں شریک ہو، لیکن نقصان میں حصہ دار نہ ہو اور منافع کی بھی متعین شرح لینے پر مُصر ہو تو یہ ایک انتہا پسندانہ سطح ہے جس میں محض سرمائے کی حیثیت سے کمائی کا حقدار بنا۔ اس مثال سے چار امور سامنے آتے ہیں۔

(۱) سرمایہ بحیثیت سرمایہ منافع کا مستحق ٹھہرا (۲) اپنے تحفظ کی ضمانت (۳) نقصان میں عدم شرکت (۴) نفع کی ایک متعین شرح۔

جہاں یہ چاروں صورتیں جمع ہوں تو یہ ربوٰ ہے۔ اور اسلام نے اپنے نظامِ معیشت میں اس کی جڑ کاٹ دی ہے۔ زنا شراب غرض کسی بُرائی کے بارے میں قرآن مجید نے وہ سخت لہجہ اختیار نہیں کیا جو ربوٰ کے بارے میں اختیار کیا ہے۔ ربوٰ کے بارے میں اس کی آتشِ غضب یوں بھڑکتی ہے۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ	اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو سُود کہ
وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ	کسی کے ذمّہ ہے چھوڑ دو۔ ہاں اگر نہیں کرو گے
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا	تو پھر اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے میں

فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۔(البقرہ) جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔

اس قدر سخت وعید کسی اور معاملے میں نہیں آئی اور اس کی بہترین وضاحت اور ہماری ذہنی سطح کے مطابق بات قرآن کے مزاج شناس اور اللہ کے پیارے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمائی:

الربوا سبعون جزءً اایسرھا ان ینکح الرجل امّہ (بیہقی)

ربٰو کے ستر جُزو ہیں اُن میں سب سے ہلکا یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں سے نکاح کرے۔

یہ انداز کھلتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی تشبیہہ کیوں اختیار کی لیکن غور کریں تو اس کی حکمت روزِ روشن کی طرح ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جن سے ہمیں طبعی طور پر نفرت ہے اور بعض چیزیں اس کے ہم پایہ بُرائی ہیں لیکن ہم انہیں جبلّی یا طبعی طور پر بُرائی نہیں سمجھتے جب کوئی شخص انہیں پہلی چیزوں کے مقابلے میں لائے گا ان سے تشبیہہ دے کر بیان کرے گا تو حقیقت واضح ہو گی۔ یہی حکمت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان میں پوشیدہ ہے۔ تم شاید اسے جرم نہ سمجھو، یہ کہہ کر خود کو مطمئن کر لو کہ سُود لے لیا تو کون سی بُرائی ہو گئی یہ دراصل ماں سے نکاح کرنے کے مترادف ہے۔ گویا ہمارے نظام شریعت میں بدترین بُرائی ربٰو قرار پاتی ہے۔ نظام سرمایہ داری میں سب سے زیادہ اہمیت ہی سرمائے اور اس کے تحفظ کو ہے اور اسلام نے اسے ربٰو قرار دے کر اس کی جڑ ہی کاٹ دی ہے۔ اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ جس میں سرمایہ مارکیٹ کو کنٹرول کرتا ہے، اس کے اتار چڑھاؤ کا باعث بنتا ہے۔ ایک شخص دس لاکھ روپے سے اپنی مالی حیثیت کا تعین کراتا ہے۔ اب وہ سٹّہ کھیلتا ہے۔ زبانی کلامی ہی خریدا اور بیچ دیا۔ لیا اور دیا۔ صرف اپنی مالی حیثیت کی بنا پر مارکیٹ میں اُتار چڑھاؤ پیدا کرتا ہے ورنہ حقیقت میں نہ کچھ لیتا ہے اور نہ دیتا ہے۔ کبھی یکدم مال خرید کر قیمتیں چڑھا دیتا ہے اور کبھی مال ریلیز کر کے قیمتیں گھٹا دیتا ہے۔ یہ سب سرمائے کا کھیل ہے۔ سرمایہ منڈی سے کھیل رہا ہوتا ہے۔

کراچی سٹاک ایکس چینج میں یہ دلچسپ صورت حال دیکھی جا سکتی ہے کہ نظری طور پر سودے ہو رہے ہیں، نہ کچھ لینا اور نہ کچھ دینا۔ پاگلوں کی طرح چیخ پکار ہوتی ہے اور سیٹھوں، ساہوکاروں کو اطلاع دینے کے لیے دوڑتے ہیں۔ یہ منڈی کا اتار چڑھاؤ ہو رہا

ہوتا ہے اور سرمایہ داروں کا کھیل۔ اسی ضمن میں انشورنس آتی ہے۔ ان سب چیزوں کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ انشورنس میں دو پہلو ہیں جو حرمت لیے ہوئے ہیں ایک تو جُوا ہے اور دوسرا سرمائے کے تحفظ کی ضمانت۔اس بات کو ایک مثال سے سمجھیے۔

ایک شخص دس لاکھ روپے سے ماچس بنانے کا کارخانہ قائم کرتا ہے۔ اور دس لاکھ روپے کی انشورنس کراتا ہے۔اس کا سرمایہ آفاتِ ساویہ کی زد میں ہے۔ کوئی اتفاقی حادثہ آگ یا سیلاب اس کارخانے کو تباہ کر سکتا ہے۔ لیکن وہ اپنے سرمائے کا تحفظ یُوں کرتا ہے کہ اس کی انشورنس کرواتا ہے اور دُوسرا ظلم یہ کرتا ہے کہ یہ تحفظ اپنی جیب پر بوجھ ڈال کر حاصل نہیں کرتا بلکہ اس کا سالانہ پریمیم بھی جو وہ ادا کرتا ہے لاگت میں شمار کرتا ہے۔ ماچس کی ایک ڈبیہ پر وہ پریمیم کی لاگت ڈالتا ہے اور ضرورتمند سے اس کی قیمت وصول کرتا ہے، صرف اس لیے کہ سرمایہ اس کا محفوظ ہو جائے کسی حادثے کی صورت میں جہاں تک اجتماعی مفاد کا تعلق ہے کہ ہمارا ایک ملک، ایک قوم ہے جس کے مادی مفادات مشترک ہیں۔ تباہی تو آگئی اور دس لاکھ روپے کا سرمایہ ملکی سطح پر ضائع ہو گیا۔ لیکن سرمایہ دار اس نقصان میں سے ایک پائی بھی برداشت کرنے کے لیے آمادہ نہیں اور خریدار کا خون چُوس کر اپنے سرمائے کا تحفظ کرتا ہے۔ یہ سرمایہ داروں کی امداد باہمی کا نظام ہے جو اپنے سرمائے کا تحفظ کر رہے ہیں اس کی حرمت کے لیے اسلام نے قطعی فیصلہ کر دیا ہے: کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ۔

ایک دائرہ اور بھی ہے جس میں بعض چیزیں حلال اور بعض حرام ہیں اور بعض وہ ہیں جن کی حلّت و حُرمت میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ان چیزوں کو ہم ایک ہی گروپ میں لاتے ہیں۔ ایک شخص محنت کر سکتا ہے۔صحت مند اور محنتی ہے لیکن اس کے پاس سرمایہ موجود نہیں۔ اس کے برعکس ایک دوسرا شخص ہے جس کے پاس سرمایہ موجود ہے۔ یہ دونوں مل کر کاروبار کرتے ہیں۔ ایک شخص سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دوسرا اس میں اپنی محنت شامل کرتا ہے۔ اس محنت اور سرمائے کے امتزاج کو مضاربت کہتے ہیں۔ یہ اسلام میں جائز ہے لیکن پسندیدہ نہیں۔ جس طرح طلاق جائز ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز۔ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ جس کے پاس صرف اس قدر سرمایہ ہے کہ وہ اپنی ضرورت ہی پوری کر سکتا ہے تو وہ

خود کاروبار کرے اور اپنی ضروریات پوری کرے لیکن اگر اس کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی موجود ہے مثلاً وہ ملازمت کرتا ہے تو اس کے پاس جو ضرورت سے زائد سرمایہ ہے وہ اپنے مجبور بھائی کو دے دے اور اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اس کی محنت میں سے حصّہ نہ بٹائے۔

مضاربت میں بھی شرط رکھی گئی ہے کہ نقصان کا پورا بوجھ سرمائے پر پڑے گا اور محنت کش ایک پائی کے نقصان میں بھی شریک نہیں ہوگا۔ اسلام نے محنت کے تحفظ کو منافع کا جائز ذریعہ قرار دیا ہے اس صورت میں وہی مضاربت جائز ہوگی جس میں نقصان کی پوری ذمہ داری سرمایہ فراہم کرنے والا شخص برداشت کرے۔ اور منافع میں وہ محنت کش کا ساجھی ہو۔ لیکن یہ وضاحت دوبارہ کرلی جائے کہ اسلام کے نزدیک یہ عمل بھی پسندیدہ نہیں۔ اس کا پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ اصل زائد سرمایہ رکھنے والا شخص یہ سرمایہ کسی دوسرے ضرورت مند مسلمان بھائی کو بطور قرضِ حسنہ دے تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے اور اس کی خوشحالی قومی خوشحالی میں حصّہ دار بنے۔ اس سے اجتماعی زندگی میں حسُن پیدا ہوگا۔ اگر آپس کے معاملات مجبوری میں طے پائیں تو یہ حسن کہاں پیدا ہوگا۔ قرآن مجید بیع کو بھی باہمی رضامندی سے مشروط کرتا ہے:

عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (النساء) یعنی تمہاری رضامندی سے۔

مثال کے طور پر آپ کو ایک جُوتا خریدنا ہے۔ آپ مارکیٹ میں گھومیں پھریں۔ آپ کو اندازہ ہے کہ اس وقت ایک معیاری جُوتے کی قیمت سَو سَوا سَو روپے ہے۔ آپ خریدتے ہیں تو اس میں کسی مجبوری کا دخل نہیں ہوتا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ اس وقت لاگت اس قدر ہے۔ اس پر منافع کی شرح اندازاً یہ ہوگی۔ یہ باہمی رضامندی کا سودا ہے لیکن کوئی ایسا معاملہ جس میں کوئی شخص کسی مجبوری کے تحت ایسا کر رہا ہو چاہیے قانوناً یہ بات جائز ہوگی کہ سرمایہ رکھنے والا شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ صاحب، وہ میرے پاس اپنی خوشی سے آیا ہے اور سرمایہ لے کر کاروبار کرنے کی صورت میں اس کے منافع میں مجھے شریک کرنے کی پیشکش کرتا ہے۔ اس میں کسی مجبوری کو کوئی دخل نہیں، کہنے کو تو یہ بات ہے لیکن حقیقتاً مجبوری کو اس میں دخل ہے۔ اگر اس کے پاس سرمایہ موجود ہو تو وہ کسی کو اپنے خون پسینے کی کمائی میں کیوں شریک کرے گا۔ یہ مضاربت کی وہ شکل

ہے جو حلال ہے لیکن اسلام اسے پسند نہیں کرتا ۔

مزارعت اس قبیل کی ایک چیز مزارعت بھی ہے ۔ ایک شخص کی زمین ہے، دوسرا اس پر محنت کرتا ہے۔اس کی پیداوار میں زمیندار کو شریک کرتا ہے۔صنعتی انقلاب کے بعد مشین اور دوسری چیزیں یا معدنیات بھی ذرائع پیداوار میں شامل ہوگئیں. لیکن قدیم ترین ذریعۂ پیداوار زمین ہی ہے اور زمین کے بارے میں بقول علامہ اقبالؒ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے :

؎ رزقِ خود را از زمیں بردن رواست
این متاعِ بندہ و ملکِ خداست

مزارعت کے بارے میں ہمارے ہاں اختلاف ہے ۔ امام ابوحنیفہؒ اسے حرام مطلق کہتے ہیں وہ کسی نوع کی مزارعت اور غیرحاضرزمینداری کو جائز نہیں سمجھتے۔ دوسرے فقہاء نے احادیث پر ذرا غور کر کے کچھ ایسے پہلو نکالے ہیں جس سے کچھ گنجائش پیدا ہوتی ہے،لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اس دور کے خاص حالات تھے۔مصالح مرسلہ یا استحسان کے اصول کے تحت ایسی گنجائش نکالی گئی ورنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت پر لفظ ربوٰ استعمال کیا ہے ۔

حضرت رافع بن خدیج کے بارے میں حضورؐ کو معلوم تھا کہ ان کے پاس کوئی زمین نہیں ہے ۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے کہیں باہر جا رہے تھے، دیکھا کہ رافع کھیت کے پاس کھڑے ہیں پوچھا ، تم یہاں کیسے ؟ انھوں نے عرض کیا : زمین فلاں کی ہے میں نے محنت کی ہے اور میرے اور اس کے مابین یہ شرح معیّن ہوئی ہے تو حضور نے فرمایا قد اربیتما (تم نے ربوٰ کا معاملہ کیا ہے) یہ زمین لوٹا دو، جو کچھ اس پر تمھارا خرچ ہُوا ہے وہ تم لے لو، اس لیے کہ اس زمین میں اس کی کون سی محنت شامل ہے جس کا وہ معاوضہ لے رہا ہے،صرف اس وجہ سے کہ زمین کا مالک ہے وہ اپنے بھائی کی گاڑھے پسینے کی کمائی سے حصّہ وصول کر رہا ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا یہ فتویٰ آنکھیں کھول دینے والا ہے اور ہمیں اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے ویسے تو یہاں ملک کی نوّے فی صد آبادی حنفیوں پر مشتمل ہے لیکن ایسے ایسے اہم معاملات میں امام ابوحنیفہ کا فتویٰ کوئی ماننے کے لیے تیار نہیں ۔ یا تو انھیں امام اعظم کہا اور مانا جاتا

ہے اور سید الفقہاء بھی، لیکن جہاں ان کا فتویٰ اچھا نہیں لگتا اسے اٹھا پھینکنے اور دیوار پر دے مارنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ یہ ہماری دوعملی ہے جس پر ہمیں غور کرنا چاہیے ۔ مزارعت اور مضاربت کو ہم نے تیسرے درجے میں رکھا ہے۔

اب آیئے چوتھی صورت کی طرف، اسلام میں جو مال موجود نہ ہو اس کے بیع کی جو شکل بھی ہوگی حرام ہوگی۔ یہ جتنے ایڈوانس سودے ہورہے ہیں، یہ تمام معاملات جن میں سرمایہ کھیلتا ہے ان سب کے دروازے بند کردیے گئے ہیں۔ بیع وہ ہے کہ مال موجود ہے اور قیمت ادا کر دی گئی یا دو چیزیں ہیں جن کا تبادلہ ہوگیا۔ ایک ہاتھ سے دیا دوسرے ہاتھ سے لیا، یہ بیع ہے اور اس میں بھی (عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ) باہمی رضامندی ضروری ہے۔ اگر مجبوری سے فائدہ اٹھایا گیا ہے، اگر کہیں مصنوعی قلت کے ذریعے سے ریٹ بڑھا دیے گئے ہیں، اگر کہیں کوئی اور کھیل کھیلا گیا ہے تو اس میں حُرمت کا پہلو شامل ہو جائے گا۔ ہمارے ہاں جو سودے بازی ہوتی ہے کہ زمین آپ نے ٹھیکے پر دی ہے، اب چاہے کسان کو کچھ بچے نہ بچے آپ کا ٹھیکہ محفوظ ہے، باغ میں ابھی پھل نہیں آیا اس کا سودا ہو گیا ہے، یہ سب حرام مطلق ہے، ہمارے دین میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ۔ اُدھار کی شکل میں صرف ایک سودا جائز ہے جسے بیعِ سَلم کہتے ہیں۔ دو چیزوں کا بالکل تعین ہوجائے اور ان میں سے ایک چیز کا لُگا دے دی جائے یہ بیع سلم ہے۔ ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ فلاں چیز فلاں وقت لے لوں گا اور یہ بیعانہ لے لیجیے ۔ اگر وقت پر وہ چیز نہ دے سکا تو بیعانہ ہضم ۔ اب یہ بیعانہ کس کھاتے میں ہضم ہو رہا ہے ۔ وہ سودا تو پورا ہو نہیں پایا ۔ یہ ساری چیزیں درحقیقت اس وجہ سے ہمارے ہاں رواج پا گئی ہیں کہ ہمارے یہاں شریعت کوئی ہیئتِ حاکمہ کی حیثیت سے ہے ہی نہیں، مارکیٹ میں جو رواج چلا وہ ہم نے اختیار کر لیا۔

اوورٹریڈنگ ایک شخص کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں اور وہ اوورٹریڈنگ میں پچاس لاکھ روپے کا مال لے لیتا ہے تو اسے ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ اگر آپ کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں تو پانچ لاکھ کا سودا کر لیجیے ۔ پانچ لاکھ اسی وقت آپ کو دے دینا ہوگا ۔ اس ادائیگی کو بیع سلم کہتے ہیں۔ بیع کے ضمن میں بھی حدود قائم کر دی گئی ہیں اور ان سب کا مقصد یہی ہے کہ سرمائے کو زیادہ کھل کھیلنے

کا موقع نہ ملے۔ اسی سلسلے میں میری زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہے کہ اسی لاہور کے ایک بڑے دارالعلوم میں ایک صاحب سے ملنے گیا۔ عالم دین ہیں، شیخ الحدیث ہیں، حدیث کا درس دے رہے تھے، میں بھی بیٹھ گیا۔ مشکوٰۃ شریف میں ایک حدیث ہے جو کئی طریق سے آئی ہے، متن وہی ہے طُرق مختلف ہیں:

"لایبیع الحاضر للبادی" یعنی کوئی کسی جگہ کا رہنے والا شخص باہر سے آنے والے کے مال کو فروخت نہ کرے۔ درس مکمل ہو گیا، موجودہ کاروبار کے بارے میں کوئی ریفرنس نہ آیا۔ ہمارے معاشرے میں بیع و شراء کے جو طریقے ہیں اس پر کوئی بحث نہ ہوئی۔ میں نے سوال کیا: "حضرت! ہمارے ہاں جو آڑھت کا کاروبار ہوتا ہے اس حدیث کی روشنی میں اس کا کیا حکم ہے؟"

شیخ الحدیث نے جو جواب دیا وہ آپ بھی سنیے اور تعجب کیجیے۔ انھوں نے مجھ سے سوال کیا: "یہ آڑھت کیا ہوتی ہے؟" اب یہ تجاہلِ عارفانہ تھا یا فی الواقع انھیں معلوم نہیں تھا۔ بہرحال میں تو نیت کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اس دور میں شہر لاہور میں ایک شیخ الحدیث جانتے نہ ہوں کہ آڑھت کیا ہوتی ہے، یہ بات بہرحال بظاہر قابلِ قبول نہیں ہے۔ میں نے جب تشریح کی کہ یہاں کچھ لوگ دکانیں بنا کر بیٹھتے ہیں منڈی ہوتی ہے، ان کا اڈہ ہوتا ہے۔ باہر سے لوگ جنھوں نے کاشت کی ہے، اناج اور سبزیاں لے کر آتے ہیں مختلف منڈیاں ہیں، وہ ان کا مال فروخت کرتے ہیں، منڈی والے کمیشن لیتے ہیں۔ ان کا جواب تھا کہ "یہ تو مطلقاً حرام ہے۔" اب اندازہ کیجیے کہ یہ فیصلہ کتنا قطعی ہے۔ اس میں بھی لوگوں نے حلال کے بہت سے پہلو نکال لیے کہ دو طرفہ آڑھت کا حکم تو یہی ہے لیکن اگر ایک طرف کمیشن لیا جائے تو وہ حرام نہیں ہو گا، اس لیے کہ دوسری شکل یہ ہو جاتی ہے گویا کہ وہ خریدار کی طرف سے وکیل بن گیا جو وکالت کر کے اس کی طرف سے مال کا خریدار ہے، اس طرح وہ اپنی وکالت کی اُجرت لے رہا ہے جس میں اس کے لیے حلّت کا پہلو پیدا ہو گیا ہے۔ اس تاویل میں بھی کسی بدنیتی کو دخل نہیں لیکن میں عرض کروں گا کہ ہمارے ہاں فقہاء نے اصول ایسے بنائے ہیں کہ جو عموم بلویٰ ہو یعنی کوئی چیز عام ہو گئی ہو یا زمانے کا ایک خاص چلن بن جاتے

اور اب اس کو بالکل ختم کرنا ممکن نہ ہو تو اسے مصالح مرسلہ کہہ لیں یا استحسان، بہرکیف ایسی چیزوں کے بارے میں فقہاء نے لوگوں کے لیے آسانی کی گنجائش پیدا کی ہے مختصراً یہ کہ اس کے اندر جو حلّت کا پہلو نکالا گیا ہے وہ یہ ہے کہ دوطرفہ آڑھت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ حرام مطلق ہے اور ہمارے ہاں اجناس، سبزیوں اور گوشت کا جو کاروبار ہوتا ہے وہ اس دوطرفہ آڑھت کی بنیاد پر ہوتا ہے، مثلاً گوشت کی قیمتوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش ہوتی ہے تو قصائی شور مچاتے ہیں کہ ساری مصیبت ان آڑھتیوں کی ڈالی ہوئی ہے جو اصل مہنگائی کا باعث ہیں۔ اس میں خرابی در خرابی یہ ہے کہ آڑھتی اپنا سرمایہ ایڈوانس کرتا ہے اور وہ ایڈوانس کر کے پابندی لگاتا ہے کہ اپنا مال میرے ذریعے فروخت کرو گے۔ یہ خالص ربوٰا ہے کہ اگر کسی نے کوئی رقم کسی کو دی اور اس رقم سے چاہے کوئی گن کر نقد معاوضہ نہیں لیا لیکن دوسرے کو اس کا پابند کیا کہ وہ اپنا مال اس کے ذریعے فروخت کرے گا یہ درحقیقت ربوٰ ہے، یہ گندگی ہے، درحقیقت "ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ"۔ بیع کے بارے میں ان حدود و قیود کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ اسلام نے اپنے فقہی و قانونی نظام میں بھی ایسے اقدامات کیے ہیں کہ سرمائے کو زیادہ کھل کھیلنے کا موقع نہ ملے۔

رومن امپائر کے عہد میں کرنسی ایجاد ہوئی تھی۔ انسان کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنی بڑی مصیبت اپنے سر پر مسلط کر رہا ہے۔ جب تک یہ کرنسی کا تصور نہیں تھا دنیا میں لین دین ہو رہے تھے لیکن تبادلے کی بنیاد پر تھے۔ اجناس کا تبادلہ تھا۔ ایک شخص نے کھیت میں کام کیا ہے اس نے فصل پیدا کی۔ دوسرا شخص کرگھے پر بیٹھا ہُوا کھدر بنا رہا ہے، دونوں اپنی ضرورت کے مطابق تبادلہ کر لیتے۔ اس میں ہورڈنگ نہیں ہوتی، وہ کتنی گندم اکٹھی کرے گا؟ لیکن جب سونے کو معین کر دیا گیا کہ ایک تولہ سونا مساوی ہے اتنے گز کپڑے کے۔ ایک تولہ سونا مساوی ہے اتنے من گندم کے۔ کرنسی کی لعنت درمیان میں آئی، اب سرمایہ داری کا آغاز ہُوا۔ آپ نے اپنی تجوری میں فرض کیجیے دس سیر سونا رکھا ہوا ہے، اب آپ کو موقع مل گیا آپ جس طرح چاہیں مارکیٹ سے کھیلیں، جس طرح چاہیں اونچا نیچا کر لیں، جس طرح چاہیں کنٹرول کریں، یہ اس سرمایہ کی لعنت ہے جس میں اصل چیز کرنسی ہے۔ اس کرنسی نے یہ

سارے امکانات پیدا کیے۔ سرمائے کی اپنی ایک فارم ہے جبکہ آجکل کی اصطلاح میں مکان اور انسانی محنت بھی سرمایہ ہے لیکن انسان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے والی فارم کرنسی نے یہ ساری مصیبتیں انسان پر لادی ہیں، ورنہ انسانی ضرورت آپس کے تبادلہ سے پوری ہو سکتی ہے۔ اس میں خواہ مخواہ تعریف کا پہلو تلاش نہ کیا جائے تو یہ ایک حقیقت ہے کہ اشتراکی ممالک میں اس وقت جو معاشی ضروریات آپس کے تبادلہ سے پوری کرتے ہیں اور کرنسی کا عمل دخل کم سے کم ہے۔ انسان ٹھوکریں کھا کر وہاں پہنچ رہا ہے جہاں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور اللہ تعالیٰ کی کتاب نے چودہ سو سال پہلے پہنچا دیا تھا: لا یبیع الحاضر للبادی" ایک شخص نے گندم پیدا کی ہے وہ آکر خود بیچے اور اگر کسی کے پاس دس ہزار روپیہ ہے وہ اس دس ہزار کی گندم خرید کر بیچے۔ لیکن اگر ایک شخص اڈہ بنا کر بیٹھ جائے اور اس اڈہ کی بنا پر کماتا ہے تو یہ حرام ہے۔ یہ حدود وہ ہیں جن سے سرمایہ کاری، سرمایہ داری نہیں بنتی۔ سرمایہ کینسر بن کر مسلط نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ کچھ اضافی اقدامات ہیں جو دولت بھی مرتکز ہو گئی ہے اسے تقسیم کرنے کے لیے، گردش میں لانے کے لیے وراثت کے احکام ہیں۔ اسلام کا رجحان ارتکاز دولت کی طرف نہیں بلکہ تقسیم دولت کی طرف ہے اور وراثت اس میں ایک اہم رول ادا کرتی ہے۔ اس طرح سے اس میں دو چیزیں مزید شامل کر لیجئے۔ انسانی کمزوریوں کو Exploit کر کے کمانا، جنس انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے اس کے اس جنسی جذبے کو مشتعل کر کے کمانا حرام مطلق قرار دیا گیا اور ہمارے ہاں فلم انڈسٹری کا کاروبار اس بنیاد پر ہے، اس لیے میں نے اس کو کمزوری کہا ہے۔ قرآن مجید نے بھی شرم گاہ کے لیے لفظ فرج استعمال کیا ہے "اندیشے کی جگہ" فصیل میں جہاں دراڑیں پڑ جائیں جس سے ایک غنیم کو اندر آنے کا موقع مل سکتا ہے وہ 'فرج' ہے چنانچہ اعضائے جنسی کو بھی قرآن حکیم فرج سے تعبیر کرتا ہے کہ انسانی شخصیت کی فصیل میں یہ سب سے بڑی اندیشے کی جگہ ہے۔ اس کا کمزور پہلو ہے۔ یہاں سے اس پر بڑی جلدی سے حملہ کیا جا سکتا ہے۔ شراب کی حرمت اور فحاشی کے کاروبار پر قدغن کی یہی حکمت ہے۔ انسان اگر دولت، دولت کیلیے کماتا ہے تو اس میں ایک بہت بڑا عنصر اس کی عیاشی کرنے کی خواہش ہوتا ہے لیکن اسلام نے عیاشی کے دروازے ہی بند کر دیے ہیں۔ اب ایک انسان سرمائے کو لے کر کیا کریگا آخر وہ سرمایہ کاہے کے لیے ہے۔ اس طریقے سے سرمائے کے ساتھ Attachment کم

کر دیا گیا ہے۔ اسلام نے سرمایہ داری پر مختلف پہلوؤں سے اور مختلف اطراف سے حملے کیے ہیں اور ان سب کا حاصل یہ ہے کہ اس نے اپنے قانونی نظام میں پرائیویٹ اونرشپ (Ownership) کی صورت بھی برقرار رکھی ہے۔ ذاتی دلچسپی کو بروئے کار لانے کا موقع دیا ہے گویا کھلا بھی چھوڑ دیا ہے، محنت بھی کرو، کوشش بھی کرو، بھاگ دوڑ کرو کھیت میں خوب محنت سے ہل چلاؤ، پسینہ بہاؤ۔ جو کچھ نکلے گا تمھارا ہے، اس پر کوئی ظلم اور جبر کے ساتھ قبضہ نہیں کر سکے گا۔ اس میں سے جو حق معیّن ہے وہ دے دو۔ اس حقِ معیّن کے ذریعے تو کفالتِ عامہ کا بندوبست ہو گیا کہ Have not اور Have کی تقسیم زیادہ نہ بڑھنے پائے اور کوئی بھی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہ جائے۔ یہ وہ نکتہ عدل ہے کہ آزادی بھی برقرار رہے اور مساوات بھی۔ اس کے علاوہ اسلام کے نظام میں یہ گنجائش بھی ہے کہ اگر کسی موقع پر زکوٰۃ اور عشر کے ذریعے سے حاصل شدہ رقوم سے کفالتِ عامہ کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں تو جبری ٹیکس وصول کرنے کا اختیار ہے۔ یعنی حقِ ملکیت کو بھی کسی بھی طرح کا تقدس عطا نہیں کیا گیا جو کسی سرمایہ دار نظام میں ہوتا ہے بلکہ وہاں اس ریاست کو جو غربا و مساکین کی کفیل ہے یہ حق حاصل ہے کہ اگر اس کی ضروریات کسی وقت اتنی بڑھ جائیں یا کوئی ایمرجنسی کی صورت ہو مثلاً جنگ شروع ہو گئی قحط نے آ لیا اور صرف زکوٰۃ و عشر سے کفالت کے تقاضے پورے نہیں ہوتے تو حکومت مزید بھی لے سکتی ہے۔ دوسری طرف اگر کسی کاروبار کو پبلک سیکٹر میں دینے سے عدل کے تقاضے پورے نہیں ہوتے تو ریاست کو نیشنلائزیشن کی اجازت بھی ہے کیونکہ اصل قدر عدل ہے مثلاً اجارہ داری ہے کسی چیز کا صرف ایک ہی کارخانہ ہے اب مالک کے لیے یہ موقع ہے کہ جو وہ قیمت چاہے وصول کرے اور لوگ دینے پر مجبور ہیں۔ اس صورت میں چونکہ تقاضائے عدل پورا نہیں ہوتا، اس صنعت کو قومی ملکیت میں لینے کی پوری آزادی ہے۔

حضرت عمرؓ کے دور میں عراق کی زمینیں فتح ہوئیں (یہ بات آپ کے ذہن میں رہنی چاہیے کہ عراق اور شام کا علاقہ انتہائی زرخیز ہے) فتوحات کے بعد مطالبہ کیا گیا کہ یہ زمینیں فوج میں تقسیم کر دی جائیں اس لیے کہ یہ مالِ غنیمت ہے۔ اس پر تنازعے کی صورت پیدا ہوئی۔ دونوں طرف سے دلائل دیے گئے تو حضرت عمرؓ کی اجتہادی بصیرت

نے فیصلہ دیا کہ اس طرح عدل کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے۔ اس لیے یہ سب ریاست کی ملکیت ہوں گی۔ اور اس پر کام کرنے والے موروثی مزارع حیثیت سے کام کرتے رہیں گے۔ البتہ اسلامی ریاست لگان وصول کرے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اگر یہ فیصلہ نہ فرماتے تو اسلام کے ذریعے دنیا میں بدترین جاگیرداری نظام رائج ہو جاتا کیونکہ ان فوجیوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ قانون کے ڈھانچے میں بھی غرباء کی مصلحت کو پیش نظر رکھا گیا۔ بجائے سرمایہ کے محنت کو اتنا تحفظ دیا گیا کہ اگر کہیں نکتۂ عدل بحال نہ رہے تو اسے نجی ملکیت سے نکال کر قومی تحویل میں لے لیا جائے۔ اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں۔ حضرت عمرؓ کا اجتہاد چمکتا ہوا سورج ہے۔ اسلامی ریاست میں دونوں نظام علیحدہ علیحدہ نہیں ہوتے، یہ بیک وقت ہوتے ہیں اور اسلام کی برکات کا ظہور صرف قانونی نظام سے نہیں ہو پائے گا جب تک کہ معاشرے میں کچھ ایسے لوگ موجود نہ ہوں جو ایمانی اور روحانی سطح پر زندگی بسر کریں کیونکہ معاشرے کی اقدار کو کنٹرول یہی لوگ کرتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں اصل قدر دولت اور سرمایہ ہے۔ جس کے پاس دولت اور سرمایہ ہے اسے بڑے سے بڑا شخص جھک کر ملے گا لیکن روحانیت کے علمبرداروں کے ہاں یہ بات نہیں۔ وہ گدڑی پوش سلطان الہند نظام الدین اولیاء جو درویش ہیں اور گویا کہ اسلام کی ایمانی تعلیمات کا مظہر اتم و کامل ہیں۔ انھیں دنیا کی کسی شئے سے رغبت نہیں۔ وہ دنیا کی کسی چیز کی ملکیت اختیار کر کے فخر کرنے والے نہیں۔ دن بھر کی ضرورت کے لیے دال روٹی اور ایک چھت سر چھپانے کے لیے ہے تو بس اس سے زیادہ کسی مزید چیز کے حصول کی خواہش نہیں۔ مال و زر کے انبار انھیں قطعاً متاثر نہیں کرتے، جب تک کہ معاشرے میں ایسے لوگ موجود نہ ہوں جو اس اعلیٰ سطح پر زندگی بسر کرتے ہوں اور وہ آیت "وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ" کا نمونہ بن جائیں، معاشرے کی قانونی اقدامات سے اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اس لیے معاشرہ میں ایک ایسا طبقہ موجود رہنا چاہیے جس سے معاشرتی اقدار کا تعین ہوتا ہے جس سے وہ ایمانی حقیقت سامنے آتی رہتی ہے کہ اصل مسئلہ معاش کا نہیں معاد کا ہے، اصل چیز دولت نہیں نیکی ہے، عمل صالح ہے، اللہ کا نام ہے اور اس کے رسول کا اتباع اور ان کی محبت ہے۔ یہ اقدار اگر معاشرے میں روشنی کے مینار کی طرح بالفعل موجود نہ ہوں تو اسلام کی برکات کا کامل ظہور

کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس بات کو ایک ناگزیر ضرورت کی حیثیت سے سامنے رکھیے کہ یہ نقشہ بھی معاشرے میں موجود رہنا چاہیے، ابوذر غفاریؓ موجود رہنے چاہئیں اور ابوذر تو ایک انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ وہ فقرائے صحابہؓ اور اصحابِ صُفّہ، جو معاشرے کے اندر موجود تھے، انتہائی مسکین روکھی سوکھی کھانے والے، جنھوں نے سب کچھ اللہ اور اس کے رسُول کی راہ میں دے دیا تھا جیسے حضرت ابوالدرداءؓ، حضرت مقدادؓ اور حضرت انس بن مالکؓ وغیرہ۔ ایسوں کے متعلق جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ چہرے غبار آلود، لیکن اللہ کے ہاں ان کا مقام یہ ہے کہ اگر کسی بات پر خدا کی قسم کھا بیٹھیں تو خدا تعالےٰ ان کی قسموں کی لاج رکھے گا۔ یہ ہے ہمارے روحانی نظام کا ایک نقشہ، اگر یہ موجود نہ ہو تو محض قانونی نظام ہمارے مسائل کا حل نہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جس نے مکہ کی زمین کا کرایہ لیا اس نے سُود کھایا کیونکہ لوگ حج کی ادائیگی کے لیے مکہ آنے پر مجبور ہیں۔ اب یہاں کے پروہت اور پنڈت ہزار ہزار روپے ایک چھوٹے سے کمرے کے چند دنوں کے لیے وصول کرتے ہیں اور یہ سارا ان کے نزدیک حلال ہے اور عیش کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ساری دولت پہلے بیروت میں عیاشیوں اور فحاشیوں پر خرچ ہوتی تھی، اب لندن، پیرس اور امریکہ میں خرچ ہوتی ہے۔ اگر صرف قانونی حیلہ بازیوں پر اکتفا کیا جائے تو یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اس لیے قانونی اور روحانی نظام کے حسین امتزاج سے ہی اسلام کا معاشی نظام ترتیب پاتا ہے اور جہاں دو کی یکجائی ہو تب کسی نظام کو اسلام کا معاشی نظام کہا جا سکتا ہے۔ یہ ہیں چند نکات جن کی روشنی میں ایک اسلامی فلاحی معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

ع
گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں

خاکسار
اسرار احمد عفی عنہ
۲۴ر اگست ۱۹۸۲ء

اسلام کا نظام محاصل

از : ڈاکٹر اسرار احمد

یہ مقالہ بتاریخ ۱۱ر جنوری ۷۹ء ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل لاہور میں جسٹس ذکی الدین پال صاحب کی صدارت میں منعقدہ لائنز کلب لاہور کے سالانہ اجلاس میں پڑھا گیا

احمدہٗ و اصلّی علیٰ رسولہ الکریم ، امّا بعد،

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

محترم صدر مجلس و صدر و اراکین لائنز کلب اور معزز حاضرین !

سب سے پہلے تو میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اس منفرد اور منتخب مجلس کو خطاب کرنے کا موقع دیا۔ میں اسے اپنے لیے ایک اعزاز متصور کرتا ہوں اور اس پر آپ کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

البتہ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مجھے گفتگو کے لیے جو موضوع آپ نے دیا ہے اس میں کسی قدر نا انصافی کا معاملہ ہوا ہے، میرے ساتھ بھی اور موضوع کے ساتھ بھی۔ اس لیے کہ میں نہ معاشیات کے میدان کا آدمی ہوں نہ مالیات کا۔ اور محاصل کا مسئلہ نہایت فنی نوعیت کا حامل اور بے حد پیچیدہ ہونے کے علاوہ بیک وقت معاشیات و مالیات دونوں سے متعلق ہے ـــ ایک ایسا ہی لطیفہ حال ہی میں اور بھی ہوا ہے اور وہ یہ کہ جناب سیّد نزہت بخاری صاحب (چیف ایگزیکٹو حیدری انٹرنیشنل فائی نینس لیمیٹڈ) نے حال ہی میں ایک مقالہ پڑھا جس کا موضوع تھا " Tax on income vs tax on produce and possession " ـــــــــــ لیکن لطیفہ یہ کہ یہ مقالہ پیش کیا گیا پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کی شعبہ جاتی انجمن یعنی مجلسِ فلسفہ کے عہدیداروں کی حلف برداری کی تقریب میں ـــ گویا وہاں موضوع کے اعتبار سے معتبر درست تھا لیکن

سامعین غلط تھے - یہاں مقرر تو یقیناً بالکل غلط ہے ، البتہ سامعین کے بارے میں میں
کچھ کہہ نہیں سکتا !۔ بہرحال میں نے یہ گمان کیا کہ میرا انتخاب موضوع کے جزو ثانی
کے اعتبار سے ہُوا ہے یعنی "System of taxation in Islam —"
میں ہے مجھ پر نگہ انتخاب اسلام کے ایک ادنیٰ خادم اور قرآن حکیم کے حقیر طالب علم
ہونے کی بنا پر پڑی ہے اور میرے لیے یہ بھی یقیناً ایک بڑا اعزاز ہے - بہرحال میں کوشش
کروں گا کہ اصل روح دین اور نظامِ اسلام دونوں کے اعتبار سے اسلام میں نظام محاصل
کے بارے میں جو کچھ میں سمجھ پایا ہوں ، آپ کے سامنے رکھ دوں !

" Taxation in Islam " کے الفاظ سے آپ سے آپ جو حقیقت
میرے نزدیک نظام معاشی کے اعتبار سے اسلام کے دو رُخ یا دو پہلو ہیں ، اور یہ
دونوں ایک دوسرے پر بہت حد تک Interdependent ہیں اور اسلام
کی برکات وثمرات کا کامل ظہور ان دونوں کے اتّصال و اجتماع ہی سے ہو سکتا ہے اور یہ کہنا
ہرگز غلط نہ ہوگا کہ اگر ان میں سے ایک پہلو نگاہوں سے اوجھل رہ جائے اور توجہ صرف
ایک ہی پر مرتکز ہو جائے تو اس سے جو تصویر سامنے آئے گی وہ بہت بعید از حقیقت
ہوگی۔ ان دو پہلوؤں سے میری مراد یہ ہے کہ اسلام کا ایک اخلاقی و روحانی نظام
ہے ۔ اور دُوسرا قانونی وفقہی نظام ، ان دونوں کے تقاضے بسا اوقات مختلف ہی نہیں
متضاد ہوتے ہیں ، تاہم اِن دونوں کے امتزاج ہی سے اسلام کا کامل نظام وجود میں آتا
ہے - آپ چاہیں تو ان دونوں پہلوؤں کو "دعویٰ" (Thesis) اور "جوابِ دعویٰ"

(Anti-thesis) سے تعبیر فرمائیں اور ان دونوں کے امتزاج کو Synthesis قرار دے لیں، بہر حال ان کے وجود سے انکار ممکن نہیں ہے!

ایک چھوٹی اور سادہ سی مثال سے بات واضح ہوجائے گی۔ کوئی شخص آپ کے ایک تھپڑ مار دے تو اگر آپ بالکل عاجز و کمزور نہیں ہیں اس لیے کہ اس صورت میں تو "قہر درویش برجانِ درویش" کے سوا اور کوئی صورت قابلِ عمل ہی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس اگر آپ بدلہ لینے پر قادر ہیں تو آپ کے سامنے دو راستے کھلے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ بدلہ لیں اور دُوسرے یہ کہ آپ معاف کر دیں۔ اسلام کا قانونی و فقہی نظام بدلے اور قصاص کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، چنانچہ قرآن حکیم فرماتا ہے "وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ" یعنی "اے ہوشمندو! تمہارے لیے قصاص ہی میں زندگی ہے!" لیکن دوسری طرف اسلام کی اخلاقی و روحانی تعلیمات ہیں جن کا تقاضا یہ ہے کہ زیادتی کرنے والے کو معاف کر دیا جائے؛ چنانچہ کہیں ارشاد ہوتا ہے کہ "وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى" یعنی "اگر معاف کر دو تو یہ تقویٰ اور خدا ترسی سے قریب تر ہے" کہیں تشویق و ترغیب کے انداز میں فرمایا جاتا ہے "وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ" یعنی "وہ لوگ جو غصّہ کو پی جائیں اور لوگوں کو معاف کر دیا کریں!" — دیکھ لیجئے کہ عفو و قصاص ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی معاشرہ ان میں سے صرف ایک پر استوار ہو سکتا ہے۔ دونوں اپنے اپنے مقام و محل پر لازم و ناگزیر ہیں اور حُسنِ معاشرت ان دونوں کے امتزاج ہی سے وجود میں آتا ہے۔

اسی پر قیاس کر کے سمجھ لیجئے کہ اسلام کے معاشی نظام کے بھی دو پہلو ہیں؛ چنانچہ ایک جانب اسلام کا قانونی اور فقہی نظامِ معیشت ہے جس کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ ایک نوع کی محدود سرمایہ داری (Controlled capitalism) ہے۔ اس لیے کہ اس میں انفرادی سرمایہ کاری کی اجازت موجود ہے۔ اگرچہ اسے "سرمایہ داری" بننے سے بعض تحدیدی اقدامات نے روک دیا ہے۔ دوسری جانب اسلام کا اخلاقی و روحانی نظامِ معیشت ہے جس کے بارے میں میں پُورے انشراحِ صدر سے عرض کرتا ہوں کہ وہ ایک نہایت اعلیٰ قسم کی روحانی اشتراکیت (Spirtual socialism) ہے، اور ایسا کامل سوشلزم ہے کہ اس سے آگے کا تصوّر بھی ممکن نہیں اس لیے کہ سوشلزم یا کمیونزم میں تو پھر بھی انسانی ملکیت

کا اثبات موجود ہے اگرچہ انفرادی نہیں اجتماعی — لیکن اسلام اپنی اخلاقی و روحانی اور صحیح تر الفاظ میں ایمانی تعلیم کی رُو سے انسانی ملکیت کی کُلی نفی کرتا ہے، چنانچہ قرآنِ حکیم میں بار بار یہ الفاظ آتے ہیں کہ "لِلّٰہِ مَافِی السَّمٰوٰاتِ وَمَافِی الْاَرْضِ" "آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے ان سب کا مالک صرف اللہ ہے!" انسان کسی اور شئے کا مالک تو کیا ہوگا — خواہ وہ زمین ہو، مکان ہو، ساز و سامان ہو، روپیہ پیسہ ہو، وہ تو خود اپنا اور اپنے وجود کا مالک بھی نہیں، اس کے ہاتھ پاؤں، اعضاء جوارح اور جسم و جان اور اس کی کُل توانائیاں سب اللہ کی ملکیت ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں ان کا امین ہوں بقول شیخ سعدیؒ ؎

اُیں امانت چند روزہ نزد ماست ؛ در حقیقت مالکِ ہر شئ خدا ست

یا بقول علامہ اقبالؒ۔

رزقِ خود را از زمیں بُردن رواست ؛ ایں متاعِ بندہ و مِلکِ خدا ست!!

اسلام کے اس رُوحانی سوشلزم کی رُو سے جس کا آغاز انسانی ملکیت کے تصور کی کلی نفی سے ہوتا ہے، اس دُنیا میں انسان کا حق صرف اس کی ضروریات ہیں اور بس!!! —
ضرورت سے زاید اس کے پاس جو کچھ ہے اس پر اس کو قانونی و فقہی حق حاصل ہو تو ہو حقیقی حق کوئی حاصل نہیں۔ یہ دراصل دوسروں کا حق ہے جسے اللہ نے صرف بطورِ امتحان اس کے تصرف میں دیدیا ہے تاکہ دیکھے کہ آیا وہ اسے حقداروں تک پہنچا کر اور "حق بحقدار رسید" والا معاملہ کرکے سُرخ رُو ہوتا ہے یا دوسروں کے حق پر قبضۂ مخالفانہ جماکر بیٹھ رہتا ہے اور اِس "قدرِ زاید" کے بل پر ابنائے نوع پر دھونس جماتا ہے اور شادیوں اور دوسری تقریبوں میں اس غصب شدہ دولت کو اللّوں تللّوں میں اُڑا کر محروموں کے زخمی دلوں پر اور نمک چھڑکتا ہے!! — اب جن کے دلوں میں ایمان واقعتاً راسخ ہوجاتا ہے اور اللہ اور آخرت پر ان کا یقین محکم قائم ہوجاتا ہے اور ان کی نگاہ ہر دم "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!" پر جمی رہتی ہے ان کی روش لامحالہ یہی ہوتی ہے جس کو قرآن نے واضح کیا ان الفاظ میں کہ "یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ!" — یعنی "(اے نبی) وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں یعنی اللہ کی راہ میں کس حد تک دے ڈالیں، کہہ دیجئے جو بھی زاید از ضرورت ہو!" — اور جس کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا اپنے

اس شعر میں کہ ؎ جو حرفِ "قل العفو" میں پوشیدہ تھی اب تک
اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار !

پھر یہ بھی کہ اسے اپنا کوئی احسان نہ سمجھو، بلکہ یہ تو تھا ہی دوسروں کا حق بفحوائے الفاظ قرآنی "وَفِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ!" ___ "ان کے مالوں میں معین حق ہے سائلوں اور محروموں کا!" اور "وَاٰتِ ذَالْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ" ___ اور ادا کرو قرابت داروں اور مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق!" ___ اس کے برعکس جو لوگ اس کائنات اور خود اپنی ذات و حیات کی اصل حقیقتوں سے بالکل بے خبر ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں ان کی روش ہوتی ہے دوسری ـ جس کا اوّلین نتیجہ ہے اسراف اور انتہائی منزل ہے تبذیر!! ___ اسراف کہتے ہیں جائز ضرورتوں پر ضرورت سے زاید خرچ کرنے کو اور یہ بھی بہت معیوب ہے ___ جبکہ تبذیر ہے بالکل بلا ضرورت صرف نمود و نمائش اور اللّوں اور تللّوں میں روپیہ اڑانا اور یہ وُہ جرم ہے جس کے مرتکبوں کو شیطان کے بھائی قرار دیا گیا ___ بفحوائے الفاظ قرآنی "اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ!" یقیناً فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں ـ اعاذنا اللّٰہ من ذالک ـ

العرض اسلام کی روحانی و اخلاقی ___ یا ایمانی تعلیمات کا حاصل اعلیٰ ترین اور عظیم ترین اور ہر اعتبار سے کامل ترین Spirtual socialism ہے، لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رُخ ہے ـ دوسرے رُخ کے اعتبار سے اسلام کا نظامِ معیشت یقیناً ایک Controlled capitalism ہے ـ اس لیے کہ اسلام قانونی و فقہی اعتبار سے افراد کو زمین، مکان، ساز و سامان حتیٰ کہ ذرائع پیداوار تک پر ایسا حقِّ تصرّف عطا کرتا ہے جو کم از کم ظاہری اعتبار سے حقِّ ملکیت سے کامل مشابہت رکھتا ہے ـ یہاں تک کہ یہ حقِّ تصرّف یا حقِّ ملکیت وراثۃً اولاد و احفاد کو منتقل بھی ہو سکتا ہے ___ العرض، اپنے قانونی و فقہی نظام میں اسلام نے انسان کے جبلّی تقاضوں کو تمام و کمال ملحوظ رکھا ہے اور نجی ملکیت (Private ownership)، ذاتی حوصلہ مندی (Personal incentive) اور آزاد معیشت (Free-enterprise) کے اصُولِ سہ گانہ کو قانونی سطح پر برقرار رکھ کر "سرمایہ کاری" کے لیے وسیع میدان پیدا کر دیا ہے البتّہ اس ضمن میں بعض نہایت اہم اور بنیادی اور حد درجہ مؤثر احتیاطی تدابیر ایسی اختیار کی ہیں

جن کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں "صحتمند سرمایہ کاری" کی فضا تو قائم رہے، لیکن یہ "سرمایہ داری" کی صورت اختیار نہ کر لے۔ ان احتیاطی تا تحدیدی تدابیر کے بارے میں تفصیلی بحث میری موجودہ گفتگو کے موضوع سے خارج ہے، صرف اشارۃً عرض کر سکتا ہوں کہ سود یعنی (Interest) — سٹہ یعنی (Speculation) اور احتکار یعنی (Hoarding) وغیرہ کی حرمت کی اصل غرض وغایت یہی ہے جو میں نے بیان کی یعنی سرمایہ کاری، سرمایہ داری نہ بن جائے، اور capitalism بہر حال Controlled رہے، — البتہ اس حقیقت سے انکار صرف ہٹ دھرمی ہی سے کیا جا سکتا ہے کہ سرمایہ کاری خواہ کتنی ہی پابند کیوں نہ ہو فرق و تفاوت کو لازماً جنم دے گی اور اس سے اغنیاء (Haves) اور فقراء (Have-nots) کا وجود میں آنا ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ اگر کسی دوڑ میں دس افراد شریک ہوں اور خواہش یہ ہو کہ وہ سب برابر رہیں نہ کوئی آگے بڑھے نہ پیچھے رہے تو اس کی تو ایک ہی صورت ممکن ہے، یعنی یہ کہ ان سب کو ایک رسّے سے باندھ دیا جائے۔ بصورت دیگر تو لامحالہ کوئی آگے بڑھے گا اور کوئی پیچھے رہ جائے گا! گویا اسلام کے قانونی و فقہی نظام میں 'جبری مساوات' (Forced equality) کا کوئی وجود نہیں ہے — لیکن اتنی ہی بڑی اور اہم حقیقت یہ بھی ہے کہ اسلام کے نظام محاصل میں اسی فرق و تفاوت کے مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کے مقصد کو اوّلین اور مقدّم ترین اہمیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اغنیاء اور فقراء کی تقسیم کو اعتباری یا عارضی یعنی (Arbitrary) نہیں رہنے دیا بلکہ اس کے لیے ایک باقاعدہ و باضابطہ حدِّ فاصل کھینچ دی ہے جسے اصطلاح شرع میں 'نصاب' کہتے ہیں جس کا تعین اموال کی تقریباً تمام بڑی بڑی صورتوں میں کر دیا گیا ہے۔ مثلاً ساڑھے سات تولے یا اس سے زائد سونے کا مالک اغنیاء میں شمار ہوگا، اور ساڑھے سات تولے سے کم رکھنے والا فقراء میں سے اور اسلام کے نظام محاصل کا اہم رکن یعنی زکوٰۃ اغنیاء سے لی جائے گی اور فقراء میں تقسیم کر دی جائے گی بقول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَاءِ هِمْ وَتُرَدُّ اِلٰى فُقَرَاءِ هِمْ"! اور اس طرح وہ تمام تقاضے بتمام و کمال اور باحسن وجوہ پورے ہو جاتے ہیں جنہیں اِس دَور میں 'اجتماعی ضمانت' — (Collective insurance) یا، سماجی تحفظ (Social security)

سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اور اس سب پہ مستزاد ہے وہ روحانی و اخلاقی اور ایمانی و احسانی تعلیم جو اسلام اپنے ہر ماننے والے اور قرآن اپنے ہر پڑھنے والے کو مسلسل دیتا ہے کہ لذّات دنیوی اور تعیّش و تنعم سے کنارہ کشی اختیار کرو۔ اپنی ضروریات کو کم سے کم کرو، اور حقیقی اور واقعی ضروریات سے جو بھی زاید ہو اسے اللہ کی راہ میں دے دو اور یہ نہ سمجھو کہ مال میں واحد حق زکوٰۃ ہی ہے۔ یہ تو کم از کم اور ناگزیر قانونی ضابطہ ہے۔ ایمان کا اصل تقاضہ و مطالبہ اس سے بہت آگے ہے۔ بموجب فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم "فِی الْمَالِ حَقٌّ سِوَی الزَّکَاۃ" مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی بہت سے حقوق ہیں ۔۔ اور اچھی طرح جان لیجئے کہ نظامِ اسلامی کا اصل حُسن و جمال اور اس کی اصل برکات اُس کی اسی دوسری اور تکمیلی تعلیم و تلقین میں مُضمر ہیں !!۔۔

اسلامی نظم مملکت میں نظامِ محاصل کے بارے میں ایک اہم اور اصُولی بات اور بھی ہے جو مدّنظر رہنی ضروری ہے اور وہ یہ کہ اسلامی ریاست اصلاً ایک نظریاتی ریاست ہے اور اگرچہ اس کی حدود میں بسنے والے تمام شہری بلا امتیاز مذہب و ملّت بعض اعتبارات سے بالکل مساوی بھی ہیں جیسے حُرمتِ جان و مال میں تاہم بہت سے اعتبارات سے شہریوں کا دو حصّوں میں منقسم ہونا لازم و لابد ہے۔ یعنی ایک وہ جو اس نظریئے کو ماننے والے ہوں جس پہ ریاست قائم ہے اور دوسرے وہ جو اسے نہ مانتے ہوں ۔۔؛ چنانچہ اسلام کے نظام محاصل کے اعتبار سے بھی ایک اہم اور بُنیادی تقسیم اسی اعتبار سے ہے کہ بعض کی ادائیگی صرف مسلمانوں پہ ہے یعنی اسلامی ریاست کے اصول و مبادی کے ماننے والوں پہ اور بعض کی غیر مسلموں پہ یعنی ان پہ جو ان اصُولوں کو نہیں مانتے، پھر یہ کہ ان دونوں کی نوعیت میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے اور ان کے مدّاتِ صَرف میں بھی اساسی اور بنیادی فرق ہے۔

چنانچہ مُسلمانوں سے نقدی کی تمام صورتوں اور اموالِ تجارت پہ زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے جس کی شرح کُل مالیت کا ۲½ فی صد ہے، ان کی زرعی اراضی میں سے نہری یا چاہی زمینوں کی کل پیداوار کا بیسواں حصّہ وصول کیا جاتا ہے یعنی ۵ فی صد ۔۔ اور بارانی زمینوں کی پیداوار سے کُل کا دسواں حصّہ وصول کیا جاتا ہے یعنی دس فی صد ۔۔۔۔ اور ان دونوں کی نوعیت TAX کی نہیں ہے بلکہ اصلاً عبادت کی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی شرح

ی بالکل معین ہے جس میں کسی ردّ و بدل کی گنجائش نہیں ہے، ورنہ ان کی حیثیت عبادت کی نہیں رہے گی بلکہ صرف ایک Tax کی رہ جائے گی۔ اسی طرح ان کی مداتِ صَرف بھی معین ہیں، ان کے علاوہ کسی مَد میں انہیں صرف نہیں کیا جاسکتا۔ جن کا مجموعی حاصل وہ اجتماعی ضمانت یا سماجی تحفظ ہے جس کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے!

اس کے برعکس غیر مسلموں کے اموال سے جزیہ وصُول کیا جاتا ہے اور ان کی زمینوں سے 'خراج' اور ان دونوں کی حیثیت خالصتہً Tax کی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی کوئی شرح بھی معین نہیں، ان کا تعین حکومتِ وقت کی صوابدید پر ہے اور اسی طرح ان سے حاصل شدہ رقوم کے صرف پر بھی کوئی پابندی نہیں، جملہ شعبہٗ ہائے حکومت کے اخراجات اور نظم و انصرامِ مملکت کے تمام تقاضے ان سے پُورے کئے جاسکتے ہیں[1]

اسلامی حکومت کی آمدنی کا ایک اور شعبہ جس کی شرح معین ہے، وہ اموالِ خمس ہیں یعنی پانچواں حصہ یا بیس فی صد جو اموال غنیمت، کنز یعنی دفینے، اور رکاز یعنی معدنیات سے وصول کیا جاتا ہے۔ ان کی جس طرح شرح وصولی زکوٰۃ و عشر کی طرح

---

[1] ایک نہایت اہم اور زوری اور فقہ حنفی کی رو سے نہایت محکم رائے یہ بھی ہے کہ پاکستان کی جملہ اراضی 'خراجی' کے حکم میں ہیں نہ کہ 'عُشری' کے حکم میں، گویا اگر امام ابوحنیفہ رح کی مزارعت کے مطلقاً حرام ہونے کی رائے کو کسی وجہ سے چھوڑ کر صاحبین یعنی قاضی ابویوسف رح اور امام محمد شیبانی رح کی رائے پر عمل کیا جائے تو بھی پاکستان کی جملہ اراضی کے کاشت کار براہِ راست ریاستِ پاکستان کے 'مزارع' ہوں گے اور ان کا "خراج" براہِ راست خزانہ عامرہ میں جمع ہوگا — جس سے TAXATION کے پورے نظام میں انقلاب آجائے گا — اور غالباً انکم ٹیکس کی تو سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ اس موضوع پر پروفیسر رفیع اللہ شہاب صاحب کی ایک مختصر تحریر اس کتابچہ کے آخر میں درج کی جا رہی ہے۔ پروفیسر صاحب اپنے بعض نظریات کی بنا پر ہمارے دینی حلقوں میں شدید 'متنازعہ' شخصیت بن چکے ہیں لیکن ہمیں تو ہدایت ہے کہ " انظروا الی ما قال ولا تنظروا الی من قال " — یعنی یہ دیکھو کہ کیا کہا جا رہا ہے، اسے نظر انداز کردو کہ کہنے والا کون ہے! لہٰذا اس معاملے میں ان کی رائے پر جملہ اہلِ علم کو غور کرنا چاہیئے۔
(اسرار احمد)

معیّن ہے اس طرح مدّاتِ صَرف بھی صِرف وہی ہیں جو زکوٰۃ اور عشر کی ۔ اس فہرست میں صرف ایک اور شق کا اگر اضافہ کر لیا جائے تو ایک پہلو سے بات مکمل ہو جائے گی اور [illegible] سکتی ہے [illegible]

۴ ۔ ضرائب | یعنی وہ مزید Tax جو حکومت حسبِ ضرورت شہریوں پر عاید کر سکتی ہے ۔ عام حالات میں بھی اگر دفاع اور نظم مملکت کی ضروریات اور فقراء کی احتیاجات مندرجہ بالا تمام مدّوں سے پوری نہ ہو رہی ہوں اور خاص اور ہنگامی حالات میں بھی جیسے زمانہ جنگ یا قحط سالی یا کسی عمومی

Depression کے باعث عام بے روزگاری وغیرہ ۔ ایسی خاص صورتوں میں اسلامی حکومت کو اغنیاء پر Tax لگانے کا غیر محدود اختیار حاصل ہے ۔

۵ - اموالِ فاضلہ یعنی منتفرق آمدنی جیسے کوئی شہری اگر لاوارث فوت ہو تو اس کی کل جائیداد اسلامی حکومت کی ملکیت قرار پاتی ہے ، اسی طرح کوئی مسلمان مرتد ہو جائے تو اس کا کل مال بھی بیت المال میں داخل ہو جاتا ہے اور اگر کوئی غیر مسلم شہری بغاوت کا مرتکب ہو جائے تو اُس کی کُل میراث بھی اسلامی حکومت کا حق ہے ۔

۶ - اوقاف وقف اگر کسی خاص مقصد اور متعین مقصد کے لیے ہوں تو ان کی آمدنی انہی مصارف پر خرچ ہوگی ، لیکن اگر کوئی شہری عام فی سبیل اللہ وقف کرتا ہے تو گویا وہ اسلامی حکومت کی ملکیت شمار ہوگا اور اس کی کل آمدنی بیت المال میں شامل کی جائے گی ۔ ان میں سے فَے ، اموال فاضلہ اور عام اوقاف تو کُل کے کل بیت المال میں داخل ہوں گے ، البتہ ان کے ضمن میں کسی شرح کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ البتہ کراء الارض ، ضرائب اور عشور کی حیثیت Taxes کی ہے اور ان کی شرح وقتاً فوقتاً تبدیل کی جا سکتی ہے جیسے بھی ضرورت داعی ہو ۔۔ اسی طرح ان کے حاصل شدہ آمدنی کے صَرف پر بھی کوئی پابندی نہیں ۔ یہ انتظام مملکت کے اخراجات اور رفاہ عامّہ ، عمومی فلاح و بہبود اور Public works سب پر خرچ کی جا سکتی ہے ۔ اگرچہ ایک رائے یہ ہے کہ ضرائب اور عشور میں سے بھی جو رقوم مسلمانوں سے حاصل ہوں گی ان کی مدّاتِ صَرف بھی صِرف وہی ہوں گی جو زکوٰۃ ، عشر اور صدقات کی ہیں ۔

اس تفصیل سے ایک جانب تو وہ حقیقت بالکل مبرہن ہو گئی جو پہلے عرض کی جا چکی ہے یعنی یہ کہ اسلامی نظمِ مملکت میں Taxation کے اعتبار سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین بڑا بنیادی فرق ہے اور یہ فرق فطری بھی ہے اور عقلی و منطقی بھی ۔ اس لیے کہ ایک غیر مسلم کے لیے اسلامی حکومت بس ایک امن و امان اور نظم و نسق قائم رکھنے والے ادارے کی حیثیت رکھتی ہے اور بس ! جبکہ ایک مسلمان کے نزدیک اسلامی حکومت زمین پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسُول صلی اللہ علیہ وسلم کی نمائندہ ہوتی ہے

اور اس کا مقصد صرف دنیوی فلاح و بہبود ہی نہیں ہونا اخروی فوز و فلاح بھی ہونا ہے
اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ قائم ہی ہوتی ہے۔ نظریۂ اسلامی کی ترویج و اشاعت اور
دنیا میں اسلام کی تبلیغ اور غلبۂ و اقامت کے لیے۔ اس لیے اس کی خیر خواہی و وفاداری
اور اس کا بقاء و استحکام مسلمان کے عین دین و مذہب کا تقاضا ہے۔ چنانچہ وہ اس
کو اپنی کمائی یا اللہ کے فضل میں سے جو کچھ دیتا ہے اسے عبادت سمجھ کر دیتا ہے۔ اُس
کے اس تصوّر کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے اس حقیقت سے کہ ان کی فرضیّت اور شرح
ادائیگی اللہ اور اس کے رسُول کی طرف سے ہیں۔ حکومت وقت صرف جمع کرنے والی یعنی
(Collector) اور تقسیم کرنے والی یعنی (Distributor) ہے نہ کہ عاید کرنے
والی اور عدم ادائیگی یا ادائیگی میں کتمان و فریب صرف قانون کی خلاف ورزی ہی نہیں ہے
بلکہ گناہ اور معصیت ہے جس کا وبال ابدی اخروی زندگی میں بھگتنا پڑے گا۔

دوسری حقیقت یہ بھی واضح ہوگئی کہ مسلمان شہریوں سے اسلامی حکومت کو جو کچھ وصُول
ہو اس میں سے اکثر کا اوّلین مصرف اس خلیج کو پاٹنا ہے جو اسلام کے قانونی و فقہی نظام میں
موجود آزاد معیشت کا لازمی نتیجہ ہے خواہ وہ کم ہو یا بیش!

تیسری اہم حقیقت جو دنیا کے دوسرے اکثر نظام ہائے Taxation سے
مختلف ہے۔ وہ یہ کہ اسلام کا غالب رجحان یہ ہے کہ Tax کے لیے اساس و
بنیاد نہ فرد بحیثیت فرد ہو جس پر Poll یا Capitation tax عاید کیا جاتا ہے،
نہ آمدنی ہو جس پر Income tax کی بنیاد ہے، نہ
وسعتِ خرچ یا Capacity to spend ہو بلکہ کُل پیداوار یا ملکیت یعنی
(Total produce or possession) ہو۔ ——— جیسا کہ زکوٰۃ یا عشر یا
خمس سے ظاہر ہوتا ہے، Tax عاید کرنے کی ان دوسری اساسات کے مقابلے میں
اسلام کی اختیار کردہ یہ اساس کن مصلحتوں پر مبنی ہے، یہ ایک دقیق فنی مسئلہ ہے؛ تاہم اس
ضمن میں ایک کوشش تو سید نزہت بخاری صاحب نے اپنے اس مقالے میں کی ہے جس کا
ذکر میں آغاز میں بطور لطیفہ کر چکا ہوں۔ ان کی تحقیق کا لبّ لباب یہ ہے کہ Income
پر tax عاید کرنے سے افراطِ زر یا Inflation کا رجحان بڑھتا ہے جبکہ

' Total produce or possession ' پر ٹیکس عاید کرنے سے اس کا قلع قمع ہوتا ہے۔ میں ایک غیر فنی انسان کی حیثیت سے ان کی دلیل کو پورے طور پر سمجھ نہیں پایا، تاہم یہ ایک اہم خیال ہے جو ایک واقفِ حال شخص نے ظاہر کیا ہے اس پر توجہ دی جانی چاہیے۔

میرے سامنے ایک عامی کی حیثیت سے اس کی ایک دوسری اور عظیم تر مصلحت آئی ہے اور وہ یہ کہ آمدنی کا صحیح صحیح حساب رکھنا "لانا ہے جوئے شیر کا" کا مصداق ہے۔ اور اس کے لیے بہت لمبے چوڑے اور Elaborate accounting کی ضرورت ہے۔ جبکہ اسلام کے نظامِ محاصل میں سے اکثر کے لیے اس کی کوئی حاجت نہیں رہتی۔ ظاہر ہے کہ بڑے بڑے شراکتی اداروں یا Limited companies کے لیے تو تفصیلی حساب کتاب ویسے بھی ناگزیر ہے تاکہ حصہ داروں کے مابین منافع کی تقسیم منصفانہ ہو سکے اور اگر یہ ادارے اپنے Size کے اعتبار سے اس Accounting پر زرِ کثیر صرف کریں تو کوئی زیادہ بار بھی نہ ہوگا۔ لیکن آبادی کی عظیم اکثریت جو چھوٹے چھوٹے کاروبار لئے بیٹھی ہے اس کے لیے حساب کتاب کا یہ معاملہ خالص دردِ سر بھی ہے اور محض ضیاع بھی ــــ یہ معاملہ چھوٹے چھوٹے دوکانداروں ہی کا نہیں ہے۔ ہمارے درمیانی طبقے کی عظیم اکثریت کا ہے۔ آپ ایک ڈاکٹر کا تصور کریں جو روزانہ اوسطاً سوڈیڑھ سو مریض دیکھتا ہے، اب اگر وہ اپنی آمدنی کا صحیح صحیح حساب رکھنا چاہے اور وہ بھی ــــ ایسا جو انکم ٹیکس آفیسر کے نزدیک 'قابلِ تصدیق' ہو تو اسے ہر مریض کا نام اور اس کو روزانہ دی جانے والی ادویات کی تفصیل کے علاوہ ادویات کی خرید و فروخت کا پورا حساب اور ان کا مکمل سٹاک اکاؤنٹ رکھنا ضروری ہوگا جس کے لئے ایک کلرک اور ایک اکاؤنٹنٹ کی خدمات لازمی ہیں ــــ اور ان سب پر جو خرچ آئے گا وہ خالص Non-productive ہوگا۔ وقِس علیٰ ذٰلک۔

اس کے برعکس اسلام کے نظامِ محاصل میں اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص سال کے آخر میں اپنی مالی حالت کا حساب بآسانی کر سکتا ہے اور اس پر زکوٰۃ ادا کر سکتا ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین ٥

عشری اور خراجی اراضی

پاکستان میں عشری نہیں صرف خراجی زمین ہے

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

اسلامی ریاست میں حکومت کی آمدنی کی سب سے بڑی مد خراجی زمین ہے۔ اور آج بھی اس آمدنی ہی سے پورے ہوتے ہیں اور اس نظام کی سب سے بڑی مد خراجی زمین ہے آج بھی اس مد سے اتنی آمدنی حاصل ہو سکتی ہے کہ کسی مزید ٹیکس کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اسلامی قانون کے مطابق تمام مفتوحہ ممالک جن میں برصغیر پاکستان و بھارت شامل ہیں' کی اراضی خراجی کے ذیل میں آتی ہیں۔ تمام اسلامی ادوار میں اس اسلامی قانون پر سختی سے عمل ہوتا رہا ہے یہاں تک کہ ۱۷۹۳ء میں انگریزوں نے بنگال کے بندوبست دوامی کے ذریعے یہاں کی اراضی کی حیثیت بدل دی اور غیر حاضر زمینداروں کا ایک طبقہ پیدا کر دیا۔ ان زمینداروں نے اپنی طرف سے عشر ادا کرنا شروع کیا اور کوشش کی کہ علماء اس کے جواز کا فتویٰ دیں لیکن چونکہ ایک دفعہ خراجی قرار دی ہوئی زمین ابد تک عشری میں تبدیل نہیں کی جاتی۔ اس لئے دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء میں اس بارے میں جو سینکڑوں فتوے پوچھے گئے ان سب کا یہی جواب دیا گیا کہ یہ اراضی کسی صورت میں عشری میں تبدیل نہیں ہو سکتی ہاں' احتیاطاً کوئی عشر ادا کر دے تو اس کی اپنی مرضی ہے۔

اس موضوع پر راقم کا ایک مفصل مضمون نوائے وقت میں شائع ہو چکا ہے مجھے توقع تھی کہ علماء کرام اس سلسلے میں کچھ وضاحت فرمائیں گے۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہاں اسلامی نظام کے نفاذ کے نعرے تو تیس سال سے لگ رہے ہیں لیکن اس مقصد کے لئے جس قدر "ہوم ورک" کی ضرورت ہے اس سے پہلو تہی کی جاتی رہی اس موضوع پر راقم نے پندرہ سال پہلے تحقیقی کام شروع کیا اور ۱۹۶۹ء میں اسلام آباد میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس میں ایک مختصر سی میٹنگ میں اسلامی نظریاتی کونسل کے اس وقت کے چیئرمین علامہ علاؤالدین صدیقی نے نظام عشر پر گفتگو شروع کی تو راقم نے بہت

سے اہل علم کی موجودگی میں اس کی تصیح کی کہ ہمارے ملک کی اراضی 'خراجی' کے ذیل میں آتی ہیں جن پر عشر کا اطلاق نہیں ہوتا ۔ اور اس کے ساتھ ہی اسلامی فقہ کی معتبر کتابوں سے تمام حوالہ جات ان کے سامنے رکھ دیئے ۔ علامہ شاہ محمد جعفر پھلواری اور ادارہ تحقیقات اسلامی کے سکالروں نے میرے نقطۂ نظر کی تائید کی چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ میں نظریاتی کونسل کی رہنمائی کے لئے ایک مسلسل کتاب اس موضوع پر تیار کر دوں جس کی نگرانی مسٹر خالد اسحاق ایڈووکیٹ کریں گے جو اس وقت اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک سینئر رکن تھے اور آج بھی اس منصب پر فائز ہیں ۔ راقم نے خالد صاحب کی لائبریری میں بیٹھ کر دو ماہ میں مطلوبہ کتاب تیار کر کے ان کے حوالے کی اور ساتھ ہی اس کے مطابق ۱۹۷۹ء کا قومی بجٹ بھی بنا دیا جس میں موجودہ ٹیکسوں میں سے ایک ٹیکس بھی نہ تھا ۔ میرا تحقیقی کام ان حضرات کے لئے اچنبھے کی بات تھی اس لئے انہوں نے مختلف ذرائع سے اسے چیک کرایا ۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کے اسکالروں نے بھی اس کی تصدیق کر دی اور پھر ادارہ نے اسے کتاب کی صورت میں اسلامی ریاست کا مالیاتی نظام کے عنوان سے شائع کر دیا ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ کہ اب جب زکوٰۃ اور عشر آرڈی ننس نافذ کیا گیا ہے تو اسلامی نظریاتی کونسل کے سامنے یہ تفصیلات نہیں تھیں ۔ اتفاق سے انہی دنوں مسٹر خالد اسحاق ایڈووکیٹ جن کی نگرانی میں راقم نے یہ تحقیقی کام کیا تھا ، ادارۂ تحقیقات اسلامی میں تشریف لاتے ۔ جہاں اسکالر اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے ۔ راقم نے خالد صاحب کو یاد دلایا کہ انہوں نے عشر کا نیا قانون بناتے وقت پچھلے تمام تحقیقی کام کو نظر انداز کر دیا ہے ۔ اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ان کے گوش گزار کی کہ اُمتِ مسلمہ کے ستر فقہی مذاہب کہ جن میں سے اکثر اب ختم ہو چکے ہیں کے تمام فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے ۔ اور اسلامی فقہ کی ڈیڑھ ہزار کتابوں میں کوئی ایسی دلیل نہیں ملتی جس کے تحت پاکستان کی اراضی کو عشری کے ذیل میں لایا جا سکے ۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کے اسکالروں نے تو کچھ ناراضگی کا بھی اظہار کیا کہ یہ ادارہ اسلامی قانون کے نفاذ کے لئے تحقیقی مواد فراہم کرنے کی خاطر قائم کیا گیا لیکن اگر ان کی تحقیق کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا تو پھر اس ادارے پر غریب عوام کے کروڑوں روپے خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے ۔ میں نے خالد صاحب سے یہ بھی درخواست کی کہ صدر صاحب نیک نیتی سے اسلامی قانون نافذ کرنا چاہتے ہیں اس لئے خدا کے لئے ان کے سامنے صحیح تفصیلات پیش کی جائیں خالد صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ نظریاتی کونسل کے چیئرمین کی توجہ

اس طرف دلائیں گے ۔ علمائے کرام کو اس مسئلہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلانے کے لئے فقہ کی ابتدائی کتاب "مالا بد" کا حوالہ یہاں غیر مناسب نہ ہوگا ۔ یہ کتاب کروڑوں کی تعداد میں شائع ہوتی ہے اور مصنف نے علماء حضرات کو نظریاتی بحثوں میں گم ہونے سے بچانے کے لئے اس میں سے وہ تمام بحثیں خارج کر دی ہیں، جن کا برصغیر پاکستان و بھارت سے کوئی تعلق نہیں ۔ عشر کا مسئلہ انہوں نے ایک چوتھائی سطر میں حل کر دیا ہے کہ چونکہ برصغیر میں کوئی عشری زمین نہیں اس لئے عشر کے مسائل بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں اور آخر میں فقہ کی سب سے بڑی کتاب فتاویٰ عالمگیری کا ایک حوالہ ملاحظہ ہو جس کے مطابق اگر کسی مسلمان علاقے پر دشمن کچھ عرصے کے لئے غالب آ جائے اور مسلمان اسے پھر دوبارہ حاصل کر لیں تو اس کی اراضی اپنی اصل یعنی خراجی حیثیت کی طرف لوٹ آئیں گی (جلد سوم اردو ایڈیشن ص۲۱۵ مطبوعہ شیخ غلام علی لاہور) اُمید ہے علماء حضرات فقہ کی کتابوں میں اس مسئلہ کا مطالعہ فرما کر اس کی صحیح اسلامی حیثیت عوام کے سامنے لائیں گے۔

خدا آں ملّتے را سروری داد !
کہ تقدیرش بدستِ خویش بنوشت
بہ آں قومے سروکارے ندارد
کہ دہقانش برائے دیگراں کشت

⁂

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

●

خواجہ از خونِ رگ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دِہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب !
انقلاب —— اے —— انقلاب !
(اقبال)

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

مسلمانوں پر
قرآن مجید کے حقوق

خود پڑھیے اور دوستوں اور عزیزوں کو تحفۃً پیش کیجئے

نوٹ

اس کتابچے کا انگریزی، عربی، فارسی اور سندھی زبان میں بھی ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ اس کے حقوقِ اشاعت نہ ڈاکٹر صاحب کے حق میں محفوظ ہیں نہ انجمن کے

شائع کردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور